جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	نعت شناسی
مصنف	:	ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی
مرتب	:	ڈاکٹر داؤد عثمانی
اشاعت اول	:	۲۰۱۱ء
صفحات	:	۲۶۰
تعداد	:	۶۰۰
کمپوزنگ	:	طاہر احمد قریشی
ناشر	:	نعت ریسرچ سینٹر،

بی۔۵۰، سیکٹر ۱۱۔اے، نارتھ کراچی، کراچی۔

Email: naatrc@gmail.com

sabeehrehmani@gmail.com

Web: www.naatresearchcentre.com

انتساب

بیدلؔ لائبریری،

اس کے لائبریرین محمد زبیر

اور معاون امان اللہ شیخ

کے نام

جو مسافرانِ علم و تحقیق کی خدمت

عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔

مشمولات

نمبر شمار	عنوان	صفحات
۱۔	نعت ہی بصیرت ہے	۱۔۸
۲۔	رفعنا لک ذکرک	۹۔۲۰
۳۔	قصری نے نعتیہ قصیدے کو نقش جلیل بنادیا	۲۱۔۲۴
۴۔	جمالِ حرم	۲۵۔۲۹
۵۔	ثنائے حبیب	۳۰۔۳۱
۶۔	پہلی کرن آخری روشنی	۳۲۔۳۹
۷۔	سرکار کی چاہت والا	۴۰۔۵۹
۸۔	فیضانِ رسول	۶۰۔۶۷
۹۔	اسوۂ احمد مختارؐ اور حافظ کی نعت گوئی	۶۸۔۷۱
۱۰۔	تلاشِ جلوۂ حرفِ سپاس	۷۲۔۷۹
۱۱۔	نسبتِ ارمان	۸۰۔۸۶
۱۲۔	نعت رسالت مآب ﷺ اور اقبال صفی پوری	۸۷۔۹۳
۱۳۔	مستقیم لہجے کی شاعری	۹۴۔۹۶
۱۴۔	صحیفۂ نعت	۹۷۔۱۰۰
۱۵۔	جادۂ رحمت کا مسافر	۱۰۱۔۱۱۰
۱۶۔	نگاہے یا رسول اللہ نگاہے	۱۱۱۔۱۱۲

۱۷۔	دل کی شاعری	۱۱۳۔۱۱۷
۱۸۔	ندائے نوری	۱۱۸۔۱۲۳
۱۹۔	نعت نگر کا خوش نوا فقیر	۱۲۴۔۱۳۲
۲۰۔	نعت کے نئے افق	۱۳۳۔۱۴۷
۲۱۔	طلوع	۱۴۸۔۱۵۷
۲۲۔	نزول پر ایک نظر	۱۵۸۔۱۶۴
۲۳۔	ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری..... ایک تاثر	۱۶۵۔۱۷۲
۲۴۔	امین راحت چغتائی کی نعت گوئی	۱۷۳۔۱۸۲
۲۵۔	غلامِ صاحبِ طیبہ	۱۸۳۔۱۸۹
۲۶۔	اساس	۱۹۰۔۲۰۵
۲۷۔	کوثری نغموں والا	۲۰۶۔۲۱۵
۲۸۔	کیفِ نعت وسلام	۲۱۶۔۲۱۷
۲۹۔	مقبول نقش کا نقشِ عقیدت	۲۱۸۔۲۲۳
۳۰۔	کشتیٔ عشق کا ساحل طیبہ	۲۲۴۔۲۲۸
۳۱۔	عقیدت کا سفر	۲۲۹۔۲۳۳
۳۲۔	ثنائے خواجہ اور اقبال عظیم	۲۳۴۔۲۳۹
۳۳۔	کرم ونجات کا سلسلہ	۲۴۰۔۲۴۷

پیش نامہ

استادمحترم ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب نے شعری اور افسانوی دونوں ادب پر اور ان کے تخلیق کاروں پر بہت کچھ لکھا۔ اس کے علاوہ تفہیم قرآن و حدیث اور مختلف موضوعات پر فکر انگیز مضامین لکھے۔ اخبارات میں کالم بھی تحریر کیے۔ غزلیں اور نظمیں کہیں اور مختلف کتابوں کے تراجم بھی کیے۔ اکابرین و احباب کے خاکے بھی لکھے اور سفر نامے سے بھی تالیف و تدوین کے باب میں اضافہ کیا۔ لسانیات پر لکھا، بچوں اور نوخواندہ بالغوں کے لئے لکھا اور درسی کتب کے حوالے سے بھی آپ کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ لیکن ذکر مصطفیٰ ﷺ اور یادِ خاتم المرسلین ﷺ سے آپ کا قلبی، روحانی اور قلمی تعلق ہمیشہ سے گہرا اور مستحکم رہا۔ اس نسبت سے آپ نے سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ پر کتابیں لکھیں۔ سیرت کے موضوع پر مضامین تحریر کیے۔ نعتیہ انتخاب شائع کیے۔ سو کے قریب نعتیہ مجموعوں پر پیش لفظ، مقدمے اور تقاریظ لکھیں اور نقدِ نعت کے حوالے سے بھی کئی مضامین لکھ کر نعت شناسی اور نعت فہمی کے نئے در وا کیے۔ اور سرکار دو عالم ﷺ کے حضور میں نعتیں بھی کہیں۔ نعت کے متعلق اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے اپنے نعتیہ مجموعے "نسبت" کے "پیش گفتار" میں لکھتے ہیں:

> نعت گوئی، اپنی جان کی قیمت پر سرور دنیا و دیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے ...... ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ انؐ کی خدمت عالیہ میں

> حاضری کا نام ہے...... شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف و صوت کی دنیا میں کبھی مل جائے۔
>
> نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے اُن چند لمحوں کا نام ہے جو وقت گزراں کے تصور کو مٹا دیتے ہیں۔
>
> نعت گوئی اُس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم ہمیں معلوم نہیں، رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار۔
>
> نعت دل زندہ کے ساتھ بیداری کی ساعت کا نام ہے۔
>
> نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

اس خیال میں ڈوب کر جب آپ نعت پر لکھتے ہیں تو بے ساختہ اپنے جذبات کو ہمارے سامنے یوں پیش کرتے ہیں:

> " لیجیے فجر کی پہلی اذان فضا میں بلند ہورہی ہے، موذن اللہ تعالیٰ کی وحدت اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے اور اب وہ کہنے والا ہے کہ الصلوۃ خیر من النوم۔ اذان فجر کی بارے میں اقبال نے کیا خوب کہا ہے:
>
> وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
> ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا
>
> آج رات آپ کی شاعری نے مجھے غفلت سے دور رکھا اور میں آپ کے دل کی دھڑکنیں سنتا رہا اور میں نے اپنے آپ کو روحانی طور پر ادب و احترام اور دیدہ نم کے ساتھ مواجہ شریف میں کھڑے ہوئے پایا۔

(ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری)

نعتیہ ادب کی ترویج و اشاعت کے باب میں برادرِ عزیز صبیح رحمانی نے استادِ محترم کی کوششوں کے متعلق درست کہا ہے:

" الحمداللہ پچھلی تین دہائیوں سے پاکستان کے ادبی منظر نامے پر شاعری کا نعتیہ آہنگ گونج رہا ہے۔ نعتیہ تخلیقات جب زیور طباعت سے آراستہ ہونے لگیں تو حرف وصوت کی اس عقیدت آمیز یک جائی میں ادبی محاسن تلاش کرنے اور نوواردانِ بساط نعت کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں بھی کشفی صاحب ہی پیش پیش نظر آئے بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنے ادبی قامت کے حوالے سے کشفی صاحب ہی واحد نقاد تھے جو نعتیہ ادب کی ترویج و اشاعت میں اپنی قابل قدر ادبی رائے کے ذریعے ناقہ ہائے بے زمام کو سوے قطار لانے کی سعی جمیل فرماتے رہے۔ تقاریظ وتبصرے سے لے کر نعتیہ آہنگ کے پوشیدہ حسن کی کشود کے لئے لسانیاتی مباحث کا سلسلہ بھی اب تک نعت کے حوالے سے کسی نقاد نے نہیں چھیڑا تھا، اس ضمن میں بھی اولیت کا سہرا کشفی صاحب کے سر ہی رہا۔ اسلامی ادب کی تفہیم، تحسین اور پرکھ کے معاملے میں کشفی صاحب کا نام اس لیے سرفہرست رہا کہ ان کی ادبی رائے مسلم، ادب شناسی غیر متنازعہ، مذہبی لٹریچر سے آگاہی لایق تقلید اور بلند ذوقی قابل رشک ہے۔ کشفی صاحب نے نعتیہ مجموعوں پر تقریظ وتبصرے اور دیباچے لکھ کر گویا اردو کے مصروف نقادوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔" ("نعت نگر کا باسی"، ص ۸، ۹)

استادمحترم کے وصال کے بعد راقم الحروف کو آپ کے نعتیہ مقدموں اور پیش لفظ کو کتابی صورت میں لانے کا خیال آیا اور اُس کا ذکر جب امی (بلقیس شاہین صاحبہ) سے کیا تو آپ نے ارادے کو سراہا اور تکمیل کے لئے دعا کی۔ پیش لفظ اور مقدموں کو جب کمپوزنگ کے بعد ڈمی کی صورت دی گئی۔ اس وقت راقم کو استادِمحترم کے کاغذات میں سے ان کے کچھ کمپوز شدہ نعتیہ مقدمے اور پیش لفظ ملے جس سے پتہ چلا کہ آپ بھی انھیں ترتیب دینا چاہتے تھے تو ایک دلی مسرت ہوئی کہ آج وہ ارادہ پورا ہونے جارہا ہے۔ ان کمپوز شدہ صفحات میں ایک تحریر " پیش گفتار" کے عنوان سے تھی جسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ اس کتاب کا ابتدائیہ ہے جو شائع ہونے جارہی تھی مگر شائع نہ ہوسکی (ویسے ہر کام کے لئے رب کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے)۔ پیش گفتار سے کتاب کی ترتیب کے ساتھ ان احباب کا تذکرہ بھی سامنے آتا ہے جن کے تعاون سے کتاب اشاعتی مراحل تک پہنچی۔ اس کے علاوہ اس تحریر میں اور بہت کچھ ہے سو آپ خود ہی پڑھ لیجیے:

پیش گفتار

اردو میں نعت گوئی کے بارے میں کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں، اگرچہ بیشتر کتابوں میں تاریخی ترتیب سے شعراء کا حال اور کلام جمع کردیا گیا ہے اور "رواں تبصرہ" سے آگے بات نہیں بڑھی ہے، مگر یہ مقام شکر ہے کہ ہمارے شاعروں کے ساتھ ساتھ ہمارے نقاد بھی نعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں نعت گوئی کے رجحانات کا جائزہ لیا جائے اور عہد حاضر میں نعت گوئی کی مقبولیت کا تجزیہ کیا جائے۔

نعت گوئی کے علاوہ اردو میں سیرت نگاری بھی مطالعہ کا اہم موضوع ہے۔ راقم الحروف نے ۱۹۶۸ء میں اردو سیرت نگاری کا ایک مختصر جائزہ تحریر کیا تھا جو ڈاکٹر نثار احمد صاحب کی مرتب کردہ کتاب "نقشِ سیرت" میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت تک میری نظر سے ایسا کوئی جائزہ نہیں گزرا تھا۔ "سیارہ" لاہور کے حالیہ شمارے سے معلوم ہوا کہ اب اس موضوع پر بھی ایک کتاب شائع ہوگئی ہے جو پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے۔

الحمدللہ سیرت رسول کریم ﷺ سے متعلق تحریر و تقریر کا آغاز میرے بچپن ہی میں ہوا۔ اپنے اسکول کے علاوہ ربیع الاول کے موقع پر پریڈ گراؤنڈ کانپور میں ہزاروں کے مجمع میں حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات طیبہ پر تقریر کرتا، کبھی اردو میں کبھی فارسی میں، اور مقامی اخباروں میں مضامین لکھتا۔ لکھنے کے سلسلے میں مولانا محمد اسمٰعیل ذبیح، خواجہ عبدالسلام اور صہبائی صاحب کی حوصلہ افزائی کو میں تشکر کے جذبات کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔

نعت پر میری تحریروں کا باضابطہ آغاز ۱۹۶۶ء میں "نقشِ سعادت" کے حرفِ آغاز سے ہوا اور الحمدللہ یہ سلسلہ پھر نہیں ٹوٹا۔ نقشِ سعادت اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک مختصر انتخاب تھا جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ میں نے تاریخی ترتیب سے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا اور اپنی نوعیت کا پہلا انتخاب تھا۔ پھر الحمدللہ ایسے انتخابات کا چلن عام ہوگیا، اور اس سلسلہ میں بہت مفصل، اچھا اور مقبول ترین مجموعہ انتخاب شفیق بریلوی مرحوم کا "ارمغانِ نعت" ہے۔ اللہ مرحوم کے

درجات کو بلند فرمائے۔

یہ اللہ کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان ہے کہ اس نے اس فقیر کو ممتاز پاکستانی شعرا کے نعتیہ مجموعوں پر مقدمے اور پیش لفظ لکھنے کا موقع عطا فرمایا۔ یوں مجھے کائنات کے فصیح ترین انسان ﷺ کے ذکر مبارک میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کتاب میں ان مقدموں اور بعض مختصر تحریروں (تقریظوں) کو یکجا کیا گیا ہے۔ بعض مقدمے کتاب کی ترتیب کے وقت نہیں مل سکے۔ انشاء اللہ انھیں اگلی کتاب میں اُن دوسرے نعت گو شعرا کے مجموعوں پر مضامین کے ساتھ شائع کیا جائے گا جن پر لکھنا میری تمنا ہے۔ ایسے شعرا میں جناب عبدالعزیز خالد، جناب حفیظ تائب، جناب اقبال عظیم، جناب حافظ لدھیانوی، جناب عاصی کرنالی اور جناب مظفر وارثی شامل ہیں۔

اس مجموعے میں اردو سیرت نگاری سے متعلق میرا مضمون شامل ہے۔ مضمون کا ایک مختصر تکملہ بھی تحریر کردیا ہے جس میں ۱۹۶۸ء کے بعد سیرت پر شائع ہونے والی کتابوں کے نام درج کردیے گئے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ ان کتابوں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے اور بعض اہم کتابوں کے نام بھی شامل نہیں کئے جاسکے۔ میں انھیں کتابوں کے نام شامل کرسکا جو میرے پاس موجود تھیں یا اپنے دوست اور بھائی پروفیسر حسنین کاظمی سے مل سکیں۔

اس کتاب میں اسلامی معاشرے میں شاعری کی حیثیت

اور اردو میں نعت گوئی کی روایت و رجحانات کے بارے میں ایک مضمون بھی شامل ہے جو میری دو تقریروں کی بنیاد پر کاغذ پر منتقل کیا گیا ہے۔ ان تقریروں کو مضمون کی شکل میری نصف بہتر بلقیس شاہین نے دی ہے۔ اللہ انھیں اس کی جزا دے۔ اس مضمون سے ان شعراء کا قدرے تفصیلی ذکر اور کلام حذف کردیا گیا ہے جن پر اس مجموعے میں مضامین شامل ہیں۔ ایسے شعراء کا نام اور حوالہ ضرور موجود ہے۔ میں اپنے بیٹے سید ابو احمد عاکف سلمہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کے توجہ دلانے پر میں اپنے تحریری کام کو جمع کررہا ہوں۔ اس خاک داں میں اپنے قیام کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر وہ شخص جو زندگی کے اٹھاون سال مکمل کرچکا ہو اس پر لازم ہے کہ آنے والی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دے۔

ان مضامین اور مقدموں کو بلقیس نے جناب مسرور کیفی کے تعاون سے جمع کیا ہے۔ میرے پاس وہ سارے مجموعے ہیں جن کے ساتھ میری تحریریں شامل تھیں۔مسرور بھائی نے نعتیہ مجموعوں کا اچھا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ بلقیس نے کہیں کہیں نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی ہے۔لیکن میرا خیال یہی تھا کہ یہ مضامین جس طرح نعتیہ مجموعوں کے ساتھ شائع ہوئے اس کتاب میں اسی طرح چھاپے جاسکیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ کتاب کو ترتیب دینے والی ذات نے یہ مشورہ کس حد تک مانا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر کام کا وقت مقرر فرمادیا ہے اس کتاب

کے مضامین کی کمپوزنگ لاہور میں کرائی گئی تھی مگر یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔کمپوزنگ کے بعد تصحیح اور دوسرے کام نہ کرائے جاسکے۔

اور پھر ۹۳ء میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے اس کام کو اپنے ذمے لیا۔ مضامین کی ازسرِنو کمپوزنگ کرائی، کاپیاں جوڑیں اور سارے کام کی تکمیل کردی۔ اب دیکھئے کہ عزیز گرامی جناب فضل ربی ندوی اس کی اشاعت میں کتنا وقت لیتے ہیں۔

سید محمد ابوالخیر کشفی

۸، ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

گم شدہ صفحات مل گئے تو انشاء اللہ اگلی کتاب استادِ محترم کے دیگر نعتیہ مقدموں، پیش لفظ اور تقاریظ کے ساتھ اسی " پیش گفتار" کی روشنی میں ترتیب دینے کی کوشش کی جائے گی۔ پیش نظر مجموعہ کو زمانی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔

آخر میں ان تمام احباب کا شکریہ مجھ پر لازم ہے جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت میں ہاتھ بٹایا۔ان میں برادرِ عزیز سید صبیح الدین صبیحؔ رحمانی کا خاص طور پر ممنون ہوں جنھوں نے کتاب کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا۔ استادِ محترم کی نعت اور تنقیدِ نعت کے حوالے سے دیگر کتابیں بھی وہ اپنے ادارہ نعت ریسرچ سینٹر کے تحت شائع کرچکے ہیں۔ یوں تو استادِ محترم کے نعتیہ ادب پر تقریباً تمام مضامین کی اشاعت کا اعزاز بھی آپ کے رسالے" نعت رنگ" کو حاصل ہے۔محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کا بھی تہ دل سے احسان مند ہوں جنہوں ۹۲ء میں اُس مجموعے کو اشاعتی مرحلے تک لے جانے کی ذمہ داری نبھائی تھی اور آج انیس برس بعد پھر جب ان نعتیہ نگارشات کی کمپوزنگ کا مرحلہ آیا تو دوبارہ یہ خدمت ان کے حصے میں آئی۔ (میرے رب کی ادا تو دیکھیے جس سے وہ جو

کام لینے کی ٹھان لے تو برسوں بعد بھی وہ کام اُسی سے لیتا ہے) جس میں اُن کے فرزند عزیزی طاہر احمد قریشی ان کے شریک رہے۔

برادرم ڈاکٹر محمد سہیل شفیق نے کمپوزنگ میں رہ جانے والی کمی بیشی کو ٹھیک کرتے ہوئے بعد میں شامل کی گئی تحریروں کو کمپوز کیا اور کتاب کو حتمی شکل دی۔ آصفہ حسین جن کا نہ صرف پیش لفظ اور مقدمے جمع کرنے میں تعاون رہا بلکہ کتاب کا پروف پڑھنے میں بھی معاونت کی اور بھائی محمد طاہر قریشی کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے کتاب کی ترتیب میں مدد کی۔ آخر میں امی کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے جن کی توجہ اور دعاؤں کی بدولت یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ ان سب کو اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

داؤد عثمانی

نعت ہی بصیرت ہے

بفیضِ والدِ مرحوم ہوں فدائے رسولؐ
ضیائے عشق مری فکر کی اڑان میں ہے

عشق رسول سے بڑا ترکہ اور عظیم تر میراث کس بیٹے کو اپنے باپ سے مل سکتی ہے۔ نعیم تقوی صاحب خوش نصیب ہیں کہ سید ضیا حسین تقوی ضیا اعتمادی مرحوم کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور ان کے فیضانِ نظر سے عشق کی ضیا اور آداب فرزندی سے بہرہ ور ہوئے۔ نعیم تقوی کی ذات اور کردار ان کے والد کی سیرت کا عکس جمیل اور الولد سرلابیہ کی تفسیر ہے۔ فلسفیانہ انداز فکر ادبی ذوق اور مذاق شعر گوئی مشرقی اور مغربی علوم سے بہرہ وافر یہ سب باتیں بڑی اہم ہیں لیکن ذات رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام سے والہانہ وابستگی ان کی شخصیت کا روشن ترین باب ہے اور یہ وابستگی ایسی صراط مستقیم بن گئی ہے کہ ایک طرف تو وہ توحید کے باب میں بڑے عزت مند ہیں اور اپنے رب کی احدیت پر کسی کا سایہ نہیں پڑنے دیتے تو دوسری طرف وہ مقام رسالت کے ایسے شناسا ہیں کہ ہر تصویر ہر عقیدہ اور ہر دوسری ذات کو اسی ذات اقدس واعظمؐ کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

میں نے حضرت ضیاء مرحوم کو نہیں دیکھا لیکن اپنے بزرگوں اور دوستوں سے ان کے تبحر علمی کا اعتراف ہی نہیں سنا بلکہ ان کی زندگی کے ایسے گوشوں سے بھی آشنا ہوا جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیرت رسول کو اپنے لئے عیار اور کسوٹی جانتے تھے‘ وہ ایسے بزرگ تھے کہ انہوں نے اپنے نفس کے میلان کو ہدایت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے

تابع کر دیا۔

لایومن احد کم حتیٰ یکون ھواہ تبعاجئت بہ (حدیث رسول کریم)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی خواہشات کو اس کے تابع نہ کردے جو میں لے کر آیا ہوں۔

حضرت ضیا اعتمادیؒ کی نعتیہ شاعری ان کی روح کا ترانۂ شوق ہے۔

ایسا ترانہ جو نئے انداز سے اب ان کے لائق فرزند کی روح کی گہرائیوں سے ابھر کر زبانِ قلم تک آیا ہے۔ حضرت ضیاء کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کھینچتا ہوں میں تصور میں سوا ان کی شبیہ
مشقِ پیہم حاصلِ ذوق نظر ہوجائے گی

عیاں ہے عشق جنوں کا جلوہ ہمارے دامن کی دھجیوں سے
روش روش پر ہر ایک دھجی قبائے گل میں جھلک رہی ہے

وہ حسن فطرت حسین صورت ہمارے دل کے مکین ٹھہرے
رگِ گلو اس مقام دل کو نگاہ الفت سے تک رہی ہے

بصیرت کے عنوان سے جناب نعیم تقوی نے اپنا نعتیہ کلام مرتب کیا ہے۔ عشق رسول کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری بھی ان کے لئے میراث پدر ہے۔

میں فیض یابِ والدِ مرحوم ہوں نعیم
پرواز ورنہ کیا مرے زورِ بیاں کی ہے

اس مجموعہ کا نام میرے خیال میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے شاعراوراس کی شاعری دونوں کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ب ص ر اس مادہ کے معنی میں روشنی شامل ہے ابن فارس کے بقول بصر کے بنیادی معانی کسی شے کو جان لیناہیں بصر کے معانی میں کسی چیز کا دل میں اتر جانا بھی شامل ہے اس لئے اس میں علم کے پہلو بھی سمٹ آئے ہیں۔ روشنی بھی

ہے اور معرفت بھی بصیرت وہ قوتِ ادراک ہے جو طبعی ذہانت سے حاصل ہوتی ہے۔ حجت دلیل عبرت اور یقین وارادہ بھی بصیرت کے معانی ہیں۔ بصیرت کا ایک مفہوم شہادت اور گواہی بھی ہے۔ نعیم تقوی صاحب نے ان مفاہیم ومطالب کو سامنے رکھ کر اپنے مجموعہ کو یہ نام دیا ہے اس باب میں ان کے علم کے پیش نظر مجھے کوئی شبہ نہیں ہے اہل ایمان کے لئے مقام رسالت سے بڑھ کر اور کون سی سعادت ہوسکتی ہے؛ اسی طرح ذات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہماری قوتِ ادراک کی اساس بھی ہے اور عیار بھی ۔ وہ ہمارے علم کی بنیاد بھی ہے اور ہمارے لئے حجت وموعظت کی علامت بھی۔ یہ جہانِ رنگ وبُو یہ آرزو صفتی وآرزو طلبی کائنات اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی چھوٹ پڑرہی ہے یا پھر اشیائے کائنات اور موجودات تلاش مصطفیٰ میں گم ہیں۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ وبو
آنکہ ازخاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ او رابہاست
یاہنوز اندر تلاش مصطفیٰؐ است

بصیرت کے قارئین اس مجموعے کے تنوع سے یقیناً متاثر ہوں گے۔ آغاز ایک حمدیہ مثنوی سے ہوا ہے اور ذکر انبیاء ونعتِ رسول کو شاعری نے حمد کا حصہ بنا دیا ہے۔ عالمِ انسانیت کے لئے انبیاء ورسل ہی اللہ کی سب سے بڑی نعمت اور عطیہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

نعیم تقوی صاحب نے خوبصورت نعتیہ قصائد بھی لکھے ہیں۔ قصیدہ نگاری کا چلن ختم ہوچلا تھا نعیم تقوی صاحب نے ذکر رسول کے لئے ایک بار پھر اس صنف کو چن کر اس کے امکانات کی طرف جدید ادبی دنیا کو متوجہ کرایا ہے کوئی پندرہ بیس سال پہلے ایک نقاد نے اعلان فرمایا تھا کہ ''قصیدہ گوئی اور نعت گوئی'' کا دور ختم ہوچکا ہے' آپ اسے

اتفاق کہیں' میں اسے خدائے جلیل کے عظیم ترین منصوبہ کا ایک جز قرار دوں گا کہ ان صاحب کے اس تنقیدی فیصلے کے بعد نعت گوئی کے ایوان میں ایسی بہت سی شمعیں روشن ہوئی ہیں جن کی روشنی محرابِ ابد تک پڑتی نظر آتی ہے۔ نعت گوئی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے اور اب ذکر رسولؐ کی نسبت سے قصیدہ گوئی کو نعیم تقوی کے ہاتھوں نئی زندگی مل رہی ہے۔ عہد حاضر میں عزیز لکھنوی نے قصیدہ کے اس امکان کو سمجھا تھا۔ اور اب نعیم تقویٰ نے اس روایت کو پھر سے جاری کیا ہے۔ ویسے قصیدہ اتنی سخت جان صنف ہے کہ وہ مرا تو پہلے بھی نہیں تھا ہاں اس نے اپنا قالب بدل دیا تھا۔ جوش کی نظموں کی قصیدہ سامانی سے کون انکار کرے گا۔

تقوی صاحب کے نعتیہ قصائد متوسط ہیں۔ ہمارے عہد میں شاید طویل قصیدوں کے لئے ابھی فضا سازگار نہیں ہے۔ یہ متوسط قصائد طویل قصائد کا دیباچہ ثابت ہوں گے۔

آئی بہار عالم امکاں بدل گیا

یہ ایک بہار یہ قصیدہ ہے اس میں بہار یہ قصیدہ کی تشبیب کی تمام روایات کو شاعر نے اپنے سامنے رکھا ہے لیکن خارجی کائنات میں بہار کے نظارے کے ذکر تک بات محدود نہیں رہی۔ یہاں شاعر کی ذات بھی اس بہار رسالت کے فیض کی ایک شہادت ہے۔

مثلِ صلیب جو تھی رگِ جاں وہ بن گئی
کہتے ہیں گل کہ شاخ کا عنواں بدل گیا

یہ شعر بہار کا خارجی بیان نہیں بلکہ اس میں بہار ایک علامت کے طور پر ابھری ہے اور پھر صلیب کی نسبت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو بھی پیش نظر رکھئے اور اس حقیقت کو بھی کہ زندگی جو صلیب تھی وہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد رگِ جاں بن گئی۔ اور رگِ جاں کے ساتھ وہ ذات ذہن میں ابھرتی ہے جو رگِ جاں سے قریب تر ہے۔

معراج النبی جناب نعیم تقوی کے محبوب ترین موضوعات نعت میں سے ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ معراج سے عبدیت کو سرفرازی عطا ہوئی کہ ہر رفعت اس مقام کے مقابل ہیچ ہے۔ قصیدہ بسلسلہ معراج النبی کے بعد ''قصیدہ سبحان الذی اسریٰ'' اسی حقیقت کی گواہی بھی کہ جناب نعیم تقویٰ مقام عبدیت کے رمز شناس ہیں۔

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

اس قصیدہ سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تقوی صاحب رسول اعظمؐ کی شان عبدیت سے بھی آگاہ ہیں اور دوسری طرف انسانیت کے شرف سے معراج کے رشتہ کو جانتے ہیں یوں ان کا قصیدہ اقبال کی شعری روایات کی ایک کڑی بھی ہے اور اس کی تشریح بھی۔

پیام صبح بیدار پئے ہر بخت خوابیدہ
بعنوان عروج عبدیت یہ شب ہے تابندہ
فرازِ عبدیت سے سج گئی ہے مسجد اقصیٰ
ہے تیرے فرق پر کج تاج ''سبحان الذّی اسریٰ''

اقبال نے پانچویں خطبہ میں معراج کے باب میں لکھا ہے کہ پیغمبرؐ کی ذات کی توانائی تو دیکھئے کہ وہ قرب خداوندی سے بھی اپنی ذات کو گم نہیں کر دیتا بلکہ اپنے آپ کو بچالاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایسی توانائی کے ساتھ اس مقام قرب سے واپس آتا ہے کہ تاریخ کے رخ کو موڑ دیتا ہے۔ نعیم تقوی صاحب نے معراج النبی کے ہر پہلو اور گوشہ کو شاعری کی زبان میں پیش کیا ہے۔ گزشتہ ربع صدی میں پروفیسر وزیر الحسن عابدی اور نعیم تقوی صاحبان کو معراج شناسی کا یہ مقام رب العزت نے عطا کیا 'اللہ تعالیٰ دونوں کو

سلامت رکھے۔

بصیرت کی نعتوں میں کئی اسالیب نظر آتے ہیں‘ کہیں ہندی الفاظ کا جادو جگایا ہے اور یوں محسن کا کوروی کی یاد زندہ کردی ہے‘ کہیں غزل کے تمام علائم ورموز کو نعت گوئی کے لئے خلاقانہ انداز میں صرف کیا ہے اور کہیں غزل کے نئے لہجے کو رام کیا ہے۔ میں اس کی تاویل یوں کرسکتا ہوں کہ جب عشق رسول کسی کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بن جائے تو ہر لہجہ ہر اسلوب بلکہ ہر لفظ اس کے تابع ہوجائے۔ امام غزالی نے علوم کو مسلمان کرنے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ نعیم تقوی جیسے اچھے نعت گو لفظوں کو بھی مسلمان کرلیتے ہیں۔

میں نے جناب تقوی کی نعتوں کے مختلف اسالیب کا ذکر ایک ہی ساتھ اس لئے کردیا کہ میں ان کی نعتوں کے چند اشعار آپ کو سنا سکوں پروفیسر آل احمد سرور کے اس خیال کو ہی ایک ادبی صداقت سمجھتا ہوں کہ اچھا انتخاب آدھی تنقید ہوتا ہے۔

تھا نہ ادراک ذرا جنبش لب سے پہلے
منزلِ فکر تھی ویران رسول عربیؐ

اس کے قدموں پہ جھکی رہتی ہے پیشانی وقت
نام لے کر جو ترا محوِ سفر ہوتا ہے

نعیم ابن ضیا تقوی کو نسبت اس حسیں سے ہے
غبار راہ میں جس کے مہ وپرویں بھی شامل ہیں

زخموں میں رقص کرتی ہے ہر دم بہارِ نو
دنیا عجیب اس دل وحشت نشاں کی ہے

چاہتا تو یہ تھا کہ چند اشعار پیش کرکے آپ سے اجازت لوں اور آپ کے اور تقوی صاحب کے درمیان حائل نہ رہوں لیکن اس شعر پر آکر یہ نکتہ عرض کرنے کو جی

چاہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خود ایک مستقل سیاق وسباق ہے جو الفاظ کے معانی کو بدل دیتا ہے۔ اس شعر میں زخموں میں بہار کا رقص اور ’’دل وحشت نشاں‘‘ کے معانی کس درجہ تعمیری حقائق کا درجہ رکھتے ہیں۔ عام عشقیہ شاعری میں ’’دل وحشت نشاں اور بہار نو‘‘ کے درمیان کوئی معنوی علاقہ نہیں نظر آتا۔ اردو کی نعتیہ شاعری میں وہی علامتیں استعمال کی گئی ہیں جو اردو غزل میں بھی ملتی ہیں مگر نعت کی دنیا میں یہ علامتیں نئی معنویت حاصل کرلیتی ہیں۔ میری دانست کی حدتک اس موضوع پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا ہے بلکہ ہوا یہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے نعتیہ شاعری کے عشقیہ لہجے اور تغزل پر اعتراض کیا ہے۔ نعت گوئی پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا

لیکن دوستو! ان نعت گوشعراء کا جگر تو دیکھو جو پرانے لفظوں کو اپنے آنسوؤں سے وضو کراکے ایک نیا وجود عطا کرتے ہیں اور بطور ارمغان بارگاہِ رسالت میں پیش کرتے ہیں۔

آیئے اب پھر میں آپ کو اپنے مختصر سے انتخاب میں شریک کرلوں۔ مختصر یوں کہ بصیرت کی چند نعتیں میرے پیش نظر ہیں۔ اس مجموعہ میں ایسے گوہر ہائے دل افروز وروح تاب اور بھی ہوں گے۔

کب سے سہتے ہیں کڑی دھوپ غم دوراں کی
تیرا در کا رہے جن لوگوں کو سایہ ہم ہیں

یہ کیا ہوا تمہیں اے آہوان صحن حرم
دہانِ زخم بھی خاموش ہیں زباں کی طرح

خاک در محبوب سے چہرے جو سجے ہیں
یہ شمس وقمر ہم سے ضیا مانگ رہے ہیں

آ سکتی نہیں پاس کبھی دھوپ اجل کی
ہم قبلہ گہہ زیست کے سائے میں پلے ہیں

اپنے والد گرامی حضرت ضیاء اعتمادی اعلیٰ اللہ مقامہ کے زیر اثر جناب تقوی نے شاعری کے کلاسیکی محاسن اور معیار کو پوری طرح سمجھا اور برتا ہے اور ایک باشعور زندہ فرد کی حیثیت سے اپنے عہد کے بہترین عناصر ادب کو اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔ ان کے اشعار میں رعایت لفظی کی جھلک بھی ہے مگر یہ رعایتیں مقصود بالذات نہیں بلکہ معانی کو چمکانے کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آپ کی چاہ میں پیاسا ہو کر
دیکھ لے کوئی بھی دریا ہوکر

ایسا شعر کلاسیکی ادب کی اعلیٰ شناسائی اور انیس کے گہرے مگر تخلیقی اثر کے بغیر نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو ان کی اقوام کی زبانوں میں پیغام ربّانی کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ رسول عربیؐ کی نسبت سے عربیِ مبین اللہ کے آخری پیغام کی زبان ٹھہری یوں آج بھی رب محمدؐ ہم سے زبان محمدؐ میں ہم کلام ہے ۔

نہ کیوں لبوں پہ تیرا نام بار بار آئے
خدا بھی ہم سے مخاطب تری زبان میں ہے

یوں جناب نعیم تقوی کا یہ شعر ختم رسالت ہی کا نہیں بلکہ دوام رسالت محمدیؐ کا اظہار بھی ہے۔

خدا کرے یہ مجموعہ بارگاہِ رسالت میں شرف قبولیت عطا کرے۔

(بصیرت/ نعیم تقویٰ، ۱۹۷۸ء، مجلس افکار اسلامی، لاہور)

رفعنا لک ذکرک

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکرِ جلیل اس کھلے آسمان کے نیچے اور عرش کی بلندیوں پر کس لمحہ نہیں ہوتا؟ حضرت راغبؔ مراد آبادی کی نعتوں کا مجموعہ رب کریم کے وعدۂ بشارت رفعِ ذکر کے سلسلہ گراں ارز کی ایک کڑی ہے۔

رفعنا لک ذکرک

اس میں ''لک'' کا ٹکڑا ملاحظہ ہو.....تمہاری خاطر تمہارے ذکرؐ کا آوازہ بلند کیا گیا۔

یہ تسلی اس وقت دی گئی تھی جب باطل کی تہ در تہ اندھیریوں میں شمعِ رسالت کی لو نے چند ہی قلوب کی فضاؤں میں چراغاں کیا تھا...... اور اس لمحہ سے آج تک یہ ذکر لبوں پر، آواز کے دائروں میں، دلوں کی دھڑکنوں میں، پلکوں کے جگنوؤں میں اور شعروسخن کی وادیوں میں جاری ہے۔ یہ مجموعہ نعت بھی اسی رفعِ ذکر کی ایک دل آویز صورت ہے...... اس رفعِ ذکر کا سلسلہ تو نور محمدیؐ کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوگیا اور اس لمحہ سے جب لوح محفوظ پر آپؐ کے اسمائے گرامی محمدؐ اور احمدؐ ثبت کئے گئے......صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضور سرورِ دیں علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید کو دین کی اساس قرار دیا ہے اور اس ملّت کا جگر دیکھیے کہ انہیں کیا کچھ نہ کہنے کے جذبہ کے باوجود اس توحید کی پاسداری کرتی ہے۔ ویسے میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ محمدؐ اور احمدؐ کا مادہ ح۔م ۔د ہے۔ یہ وہ ذات گرامی

ہے کہ جس کے افعالِ محمودہ اور صفاتِ محمودہ نے اسے مقامِ محمود کی بلند ترین مسند پر بٹھادیا چودہ صدیوں کی دوری کے باوصف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہی نہیں بلکہ ان دھڑکنوں کا آہنگ ہیں۔ حضورؐ کی تعریف کے لئے آپؐ کی صفات اور مقامِ بلند سے آگہی لازم ہے۔ آپؐ کے حسن اور رعنائی کے چشمہ تک پہنچنا واجب ہے اور یہ جاننا ناگزیر ہے کہ مقامِ محمود وہ مقام ہے جہاں آدمی حُزن اور خوف سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ حضورؐ تو اس مقام پر فائز تھے ہی ان کا ذکر بھی ان کے مدح خوانوں کو حزن وخوف سے بے نیاز کردیتا ہے۔ مجموعہ نعت راغب میں وہ دل آسودہ نظر آتا ہے جو میراث پیغمبری ہے.....محمدؐ کے معنی ہیں' وہ ذات جو مسلسل حمد وستائش کا سبب ہواور احمدؐ وہ جو خود بے حد حمد وستائش کرنے والا ہو۔ یوں محمدؐ اور احمدؐ یہ دونوں اسمائے عالی آپ کی ذات گرامی کے دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرلیتے ہیں۔

حضرت راغب کی سعادت ازلی میں اب کسے شبہ رہے گا کہ وہ نہایت زودگوئی' قادرالکلامی اور کہنہ مشقی کے باوجود اپنے کلام کی اشاعت سے بے نیاز رہے' اور اب اس طرف راغب ہوئے ہیں تو رفعنا لک ذکرک کے تحت۔

۲

حضرت راغبؔ مراد آبادی کی عمر شعر گوئی کم وبیش ۴۷ سال ہے۔ وہ ہماری صدی کی چوتھی دہائی میں حضرت صفیؔ لکھنوی' مولانا ظفر علی خان اور سیماب اکبرآبادی جیسے اکابر کی توجہ کا مرکز اور موضوع بن چکے تھے۔

اپریل ۱۹۴۵ء میں مولانا ظفر علی خان نے ان کے بارے میں لکھا.....''مبدء فیاض سے انہیں ذوق سخن سرائی بدرجہ وافی ارزانی ہوا ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اصناف سخن میں کوئی ایسی صنف نہیں ہے جس پر انہیں پوری قدرت حاصل نہ ہو۔'' یہ الفاظ اس شاعر کے ہیں جو اردو کے نہایت قادر الکلام شعراء میں سے ایک تھا۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے خیال میں اردو نے تین قادرالکلام شاعر پیدا کئے ہیں۔ سوداؔ' اکبر الہ آبادیؔ اور ظفر علی خاںؔ.....نظیرؔ' انشاءؔ اور انیسؔ کے ہوتے ہوئے ان تین شعراء کا انتخاب سید صاحب کے ذوق نظر اور ایک مخصوص زاویۂ فن کا غماز ہے۔ قافیوں کو ان تینوں کی طرح کس نے رام کیا تھا۔

حضرت صفیؔ نے جناب راغبؔ کے فکروفن کے تعمیری پہلو کا ذکر مئی ۴۵ء میں ان الفاظ میں کیا۔''موصوف ایک ہونہار' خوش فکر' مہذب ومتین شاعر ہیں اور ان کا کلام تہذیب اخلاق اور اصلاح معاشرت کے سبق آموز مضامین سے مالا مال ہے۔ قطعات ابن یمین کی طرح' جو فارسی زبان میں ہیں' ان کے اردو قطعات کا مجموعہ بھی اس قابل ہے کہ بعدِ اشاعت نصاب تعلیم میں داخل کیا جائے۔''

سیمابؔ اکبرآبادی بڑے شاعر بھی تھے اور سخت نکتہ چیں بھی۔ فنی کمزوریوں سے سمجھوتہ کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے راغبؔ صاحب کے بارے میں لکھا کہ .....''راغبؔ صاحب کی فکر وتخیل میں غیر معمولی طور پر آزادی وبلندی پائی جاتی ہے۔''

میں تو تحقیقی مقالوں میں بھی غیر ضروری حوالے پیش کرنے کے خلاف ہوں اور خود کنواں کھودنے اور پانی پینے کا قائل ہوں لیکن یہ رائیں میں نے آپ کی خدمت میں اس لئے پیش کیں کہ راغبؔ صاحب کی شعر گوئی کی عمر اور اکابر کی نظر میں ان کے فن کے امکانات آپ کے سامنے آسکیں۔

کم لوگوں کی روشنیٔ طبع ان کے لئے اس طرح اور اس درجہ بلا ثابت ہوئی ہوگی جس طرح راغبؔ صاحب کی روشنی طبع ان کے لئے بلا اور ہمارے لئے ''فتنہ'' بنی ہے۔ یہاں فتنہ کے عربی مفہوم' یعنی آزمائش کو ذہن میں رکھئے۔ وہ اتنی تیزی اور آسانی کے ساتھ شعر کہتے ہیں کہ حلقہ یاراں کی زودگوئی کو تماشے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مولانا

ظفر علی خان کو بھی میں نے اپنے بچپن میں یوں ہی شعر کہتے دیکھا ہے جیسے ہم آپ باتیں کرتے ہیں۔ رئیسؔ امروہوی صاحب بھی اس باب میں معروف ہیں لیکن دو آدمیوں کی بدیہہ گوئی اور زود سخنی کا میں نے اکثر مشاہدہ کیا ہے۔ راغبؔ صاحب اور ڈاکٹر اسلم فرخی......میں اسلم سے کہتا ہوں کہ یہ آسان گوئی کہیں تمہارے مرتبہ شعر پر تو اثر انداز نہیں ہو رہی......؟ ہمارے ایک گھڑی ساز دوست تھے' کوئی ان کے پاس گھڑی بنوانے آتا تو مہینے سے پہلے کی تاریخ ہی نہ دیتے اور ادھر وہ آدمی آجاتا اور ادھر گھڑی ٹھیک کردیتے۔ میں پوچھتا کہ یہ کیا حرکت ہے......؟ جواب دیتے کہ ......''اگر فوراً بنادوں تو غریب کو مایوسی ہوگی' اور پھر پندرہ بیس روپے دینا کتنا کھلے گا۔'' راغبؔ صاحب اور اسلم جس رفتار سے شعر کہتے ہیں اس سے ان کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور دوسرے بھی مایوس ہوتے ہیں۔ پھر راغبؔ صاحب کو رباعی کے بارے میں درجۂ تخصیص حاصل ہے۔ رباعی کا وزن ان کی شخصیت اور ذات کے اجزاء وعناصر کے ساتھ ہم وزن ہوگیا ہے۔ رباعی کے جن کو رباعی کے بوتل میں بند کرنا کچھ انہیں کا کام ہے۔

میں علم' مرتبہ اور عمر ہر لحاظ سے راغبؔ صاحب سے کم تر ہوں۔ انہوں نے مجموعہ نعت کے مقدمہ نگار کے طور پر میرا انتخاب کرکے میری عزت افزائی فرمائی ہے اور مجھے ذکر رسول عربیؐ کا ایک موقع فراہم کرکے سعادت میں شریک کرلیا ہے۔ ان کے کرم کے ساتھ مجھے اس میں حضرت نبی محترم حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ بھی نظر آتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں:

کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

میں عام ادبی کتابوں پر مصنف کے سوا کسی اور کے مقدمہ کا قائل نہیں۔ صرف مجموعہ نعت کو مستثنیٰ قرار دیتا ہوں کہ اس سے ذکر رسولؐ کا سلسلہ پھیلتا ہے۔

میرا اور راغبؔ صاحب کا رشتہ بہت عجیب ہے۔ ہم ایک دوسرے کے گھر نہیں

آئے گئے۔ نہ ایک دوسرے کی نجی محفلوں میں شریک ہوئے' مگر جب بھی ان سے ملاقات ہوئی ایسا محسوس ہوا کہ اس شناسائی کا رشتہ کسی اور جہاں سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ......جو روحیں اس دنیا میں ایک دوسرے کی دوست ہوتی ہیں' ربّ ذوالجلال انہیں اس خاکدان میں ملا دیتا ہے......سراج الدین ظفرؔ مرحوم اور راغبؔ صاحب سے میرا رشتہ غالبًا اسی نوعیت کا ہے۔

میں نے راغبؔ صاحب کو جب کبھی جامعہ نگر آنے کی زحمت دی تو کسی نعتیہ مشاعرے یا محفل میلاد کے سلسلے میں۔ ایسے ہی کسی موقع پر انہوں نے فرمایا تھا کہ غالبؔ کی زمینوں میں انہوں نے خاصی نعتیں کہی ہیں۔ میں نے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا کہ' کاش ایسی نعتوں کی تعداد تریسٹھ(۶۳) ہوجائے اور یہ ایک مجموعہ کی صورت میں شائع ہوجائیں۔ حضورؐ کے وجود نے تریسٹھ(۶۳) سال تک اس ارض خاکی کو غیرت دہ فردوسِ جناں بنایا' اور آپؐ کی حیاتِ ارضی کی نسبت سے میں نے تریسٹھ نعتوں کی فرمائش کی ...... وہ نہ جانے کون سی گھڑی تھی کہ میری خواہش اچھوں کی دعا کی طرح مقبول ہوگئی اور راغبؔ صاحب کو خدائے محمدؐ نے اس دعا کی تکمیل کا وسیلہ بنایا۔

ایک دن راغبؔ صاحب نے فرمایا کہ :۔''مجموعہ نعتِ شہِ ابرار'' تیار ہوگیا ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ' کاش آپ صنعت غیر منقوطہ (غیر منقوط الفاظ کے اہتمام کے ساتھ) میں بھی ایک دو رباعیاں اس مجموعے کے چہرے کے طور پر کہہ لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پاک ناموں میں کوئی نقطہ نہیں ہے۔ یہاں بھی رب ذوالجلال نے اپنے اسم ذاتی اور اپنے رسولؐ کے ناموں میں مطابقت پیدا کردی ہے۔ میری یہ عرض میری زندگی کی سعادت بن گئی' معلوم ہوا کہ راغبؔ صاحب نے دونشستوں میں ترسٹھ رباعیاں کہہ لیں' اور اب ان رباعیوں کا مجموعہ بھی انشاء اللہ اس مجموعہ کے بعد شائع ہوگا۔ اس مجموعہ کے آغاز میں ایک ایسی رباعی شامل ہے۔

عالم کی اساس احمدؐ مرسل ہے
موردِ الہام و وحی کا اکمل ہے
واللہ، عمل دل سے کرے کوئی اگر
ہر مسئلے کا، ورد محمد حل ہے

حضورؐ کے نام نے اسم اعظم کی طرح اس صنعت کو معنویت کی کلید سے فتح کرلیا ہے۔ شاعر کی کامیابی کی ضمانت صرف یہی بات ہے کہ آپ مجموعی طور پر اس کے شعر کو قبول کریں اور کسی صنعت کی موجودگی کا احساس اس کے بعد ہو۔ صنعت مقصود بالذات نہیں بن سکتی۔

۳

یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے، منصفی کرنا آپ کا کام ہے۔ ویسے ادبی طور پر یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ غالبؔ کی زمینوں کو نعتوں کا لباس مہیا ہوگیا۔

غالبؔ کی دلکش غزلوں کو راغبؔ
نعتوں کا لباس دے دیا ہے میں نے

یہ بات بھی میرے نزدیک اتفاقی نہیں وہ مردِ آزاد کہ اسد اللہ خاں غالبؔ کہلاتا تھا، عاشق رسولؐ بھی تھا اور مرتبہ دان رسالت بھی۔ اس عالم اسباب میں رسول، اللہ کی رضا اور منشا کی تکمیل کا وسیلہ ہوتا ہے۔ مجھے تو اردو اور فارسی کی نعتیہ شاعری کے گنجینۂ گوہر میں ایسا موتی نظر نہیں آیا۔

تیر قضا ہر آئینہ ازترکش حق است
لیکن کشودِ آں زِکمانِ محمدؐ است

میں نے راغبؔ صاحب کی نعتوں کو شعروادب کے ایک طالب علم کی حیثیت ہی سے نہیں پڑھا بلکہ مضامین وعقائد پر بھی نظر رکھی ہے اور میں پورے یقین سے یہ بات

کہہ سکتا ہوں کہ راغبؔ صاحب اپنے عقائد صحیحہ اور عشق رسولؐ کے سہارے اس پل صراط سے رقصاں وغزل خواں گزر گئے۔ عرفی کا یہ تنبّہ ان کے کانوں میں گونجتا رہا۔

عرفی، مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا
ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را

راغبؔ صاحب کے قدموں کو توحید کی قوت اور جذبۂ عشق رسولؐ نے اس تلوار پر مستقیم اور سلامت رکھا ہے مگر اس ہوشیاری میں بھی سرمستی شامل ہے۔

یہ مختلف کیفیتیں نعت کے سوا اور کس صنف میں یوں جمع ہوسکتی ہیں؟

اس مجموعے پر تفصیل سے لکھنے کو جی چاہتا ہے، مگر صرف چند گھڑیاں میرے پاس ہیں کیونکہ راغبؔ صاحب ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر یہ مجموعہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرنا چاہتے ہیں اور اب وقت نہیں۔

اس مجموعے کی نعتیہ غزلوں کے اشعار بھی اردو غزلوں کے اشعار کی طرح مفرد حیثیت رکھتے ہیں لیکن جس طرح ایک اچھی غزل اپنی ایک فضا رکھتی ہے وہی فضا ان نعتیہ غزلوں میں بھی موجود ہے۔ آپ اگر کسی بڑے شاعر کی غزل کے اشعار کی ترتیب بدل دیں تو غزل کی مجموعی فضا بکھر جائے گی اور اس کی معنویت مجروح ہوگی۔ کچھ ایسی ہی فضا اور کلّی معنویت مجھے اس مجموعے کی نعتیہ غزلوں میں نظر آئی ہے، پہلی ہی غزل کے پہلے تین شعر دیکھئے کہ ایک دوسرے سے کس طرح مربوط ہیں۔

مدحتِ خیرالبشرؐ اعجاز ہے تحریر کا
یہ بھی اک انداز ہے قرآن کی تفسیر کا
لکھ رہا ہوں صفحۂ قرطاس پر نعتِ رسولؐ
موج زن ہے ایک بحر بیکراں تنویر کا
اک سراپا نور کی بعثت ہے اے ارضِ حجاز
ذرہ ذرہ طور ساماں ہے جہان پیر کا

نظر بظاہر دوسرے شعر کو پہلا شعر ہونا چاہئے تھا۔(یعنی مطلع کا مفہوم اور مضمون یہ ہوتا)لیکن خیرالبشرؐ کے ذکر سے پہلے اپنااور اپنی تحریر کا ذکر کیا کوئی مومن شاعر کرسکتا ہے؟

مطلع میں کتاب اور حامل کتاب کا رشتہ کس حسن سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول' لباس شعر میں جلوہ فگن نظر آ تا ہے۔کسی نے جناب عائشہؓ سے کہا کہ' ہمیں رسولؐ کی سیرت کی کوئی بات بتائیے۔ جواب ملا' کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے؟'' گویا قرآن سیرت رسولؐ سے عبارت ہے۔ قرآن کا موضوع انسان اور انسان سازی ہے اور نبی کریمؐ کی ذات کریم اس کی عملی مثال ہے۔ اعجاز تحریر کے ذکر کے بعد شاعر اپنی کاوش کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس کا پہلا شعر اس دیباچہ وتمہید کے بعد نغمہ میلاد بن کر فضا میں گونج اٹھتا ہے۔

اک سراپا نور کی بعثت ہے اے ارضِ حجاز

اس بعثت کے سلسلے میں طور کے ذکر سے شاعر نے یہ بات واضح کردی کہ حضورؐ کی بعثت دعائے خلیل اور نوید مسیحا کے ساتھ ساتھ تمام انبیائےؑ کرام کے مقصد بعثت کے اتمام کا اعلان ہے۔

راغبؔ صاحب کی نعتیہ غزلوں میں ایسی عشقیہ لے ہے جس میں جنیدؔ و بایزیدؔ کی ''نفس گم کردگی'' کا عکس نظر تا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ مقصد بعثت اور عالم انسانیت پر حضورؐ کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے اتباع اسوۂ حسنہ کے فیوض وبرکات کو شاعرانہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اپنے علم کو جذبے کی زبان عطا کرنا ایک ادبی فتح ہے۔ شاید مجھے یوں کہنا چاہیے عطائے رب ہے۔

ان نعتیہ غزلوں کے مطالعہ کے دوران کئی شعر غالبؔ کے شعروں کی یاد دلاتے ہیں اور غالب کی غزل کو نعت کا لباس دینے کی بات لطف دے جاتی ہے۔ کئی قافیے' ٹکڑے اور اسالیبِ اظہار' موضوع کے بدلنے سے ایک نئی فضا تخلیق کرتے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا(غالبؔ)

جس کا امتی ہونا زندگی کا حاصل ہے
آ کے اس کے قدموں میں زیست کا مزا پایا

اور یہ وہ منزل ہے جہاں غالبؔ اور راغبؔ کے شعر اپنے آپ کو ایک دوسرے میں گم کردیتے ہیں۔ غالبؔ نے ''عشق'' کی اصطلاح استعمال کی اور ''اس کے قدموں تک پہنچنا'' اس اصطلاح کا مفہوم بن گیا ہے۔ یوں دونوں شعراء ایک دوسرے کا ضمیمہ اور تکملہ بن گئے ہیں۔

غالبؔ کے ایک مصرعے کی تضمین ملاحظہ ہو۔

جو سب سے محترم بعدِ خدا ہے
''ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا''

غالبؔ کا یہ شعر بہت خوبصورت ہے لیکن راغبؔ صاحب کی تضمین پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غالبؔ کا دوسرا مصرع سوسال سے زیادہ عرصے سے اس مصرع کا منتظر تھا۔ غالبؔ نے وحدت الوجود کی بات کی تھی۔ ذات رب میں فنا ہو کر مقام بقا پر پہنچنا' مقصود حیات ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک ہماری پہچان اور تشخص کا سوال ہے' اس کا رشتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

غالبؔ کے فیض نے راغبؔ صاحب کی نعتیہ غزلوں میں اپنی راہ آپ بنائی ہے اور بعض نہایت بلیغ ترکیبیں سامنے آتی ہیں۔

آ گئے خلدِ رسالت میں سفر ختم ہوا
کشتیٔ شوق کا لنگر سر ساحل باندھا

خلد رسالت کی ترکیب میں ہمارا دور اور ہر آنے والا دور سمٹ آیا ہے۔علیمؔ نے حضورؐ کے بارے میں کیا اچھا کہا ہے :

اور اب خدا کے اس آخری آدمی کا عہد ہے جس کا دامن، روز حشر سے بندھا ہوا ہے۔ وہ آخری آدمی جو برزخِ کبریٰ ہے انسان اور خدا کے درمیان ......وہ جو عرش وفرش کے درمیان وسیلہ ہے ۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی تقدیر کا دوسرا نام ہے۔ اور ان کا لایا ہوا دین، تقدیر کائنات ہے۔

وہ اک انسان تھا ، انسان کی تقدیر بھی تھا
مرسلؐ فرش نشیں، عرش کی توقیر بھی تھا

وہ جو انسان کی تقدیر ہے، جس کی رسالت پایانِ وقت تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے معجزے بھی ماضی کا حصہ نہیں ہوسکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوجاوداں معجزے ہیں۔ قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ......لیکن ارباب نظر کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے معجزات بھی ابدیت آثار ہیں۔ مثلاً معراج مصطفویؐ......نبیؐ کا کوئی معجزہ اور زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوسکتا جس کا رشتہ اور علاقہ عالم انسانیت سے نہ ہو۔ اقبالؔ نے معراج کے اس پہلو کو کتنے ہی مقامات پر نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردُوں

راغبؔ صاحب نے معراج کی حقیقت کو غزل کی زبان اور استعارے میں پیش کیا ہے وہ ''جنبشِ زنجیرِ در'' جو معراج کی شب پیدا ہوئی تھی، راغبؔ کی نظریں اسے آج بھی دیکھ رہی ہیں اور کون جانے کہ اسی جنبش کی آواز ان کے نعتیہ اشعار کے آہنگ میں ڈھل گئی ہے۔

ہے وہی جنبش زنجیر در اب تک، کہ جو تھی
شب معراج نبیؐ ختم سفر ہونے تک

غزل کی ایمائیت اور رمزیت کے سہارے راغبؔ نے اپنے بعض اشعار میں کسی مضمون کے کتنے ہی پہلو سمیٹ لئے ہیں۔ ان کے ایسے شعر تو خیال اور زمانے کے آئینہ خانے ہیں۔ ایسے آئینہ خانے جن میں کئی صدیوں کے آثار وشواہد کے نور کا انعکاس نظر آتا ہے۔

روضۂ احمد مرسلؐ پہ نظر آتا ہے
اس کی رحمت کا ہم آغوش دعا ہوجانا

گنبد خضرا کے سائے تلے مجھے اپنی دعائیں آغوش رحمت خداوندی میں نظر آئی تھیں اور میں نے اسی پس منظر میں شعر سمجھا اور بلقیس کو سنایا، بلقیس کہنے لگیں کہ ''مجھے تو اس شعر کے ایک اور مفہوم نے زیادہ متاثر کیا ہے، روضہ احمد مرسلؐ تو دعائے ابراہیمؑ کی قبولیت کی تجسیم ہے۔

راغبؔ صاحب اردو کے کلاسیکی ادب کے نہایت اچھے مبصر ہیں۔ غالبؔ کے اثرات کے علاوہ ان کے ہاں بعض اور آوازیں ان کے تخلیقی لہجے میں ڈھل کر ایک نئے قالب میں سامنے آئی ہیں، مثلا۔

چلنا اکڑ کے فرشِ زمیں پر نہیں روا
کچھ تو خیالِ خاطرِ ذرات چاہیے

خیالِ خاطرِ ذرات مہذب معاشرے کا ایک تقاضا ہے، مگر خیالِ خاطرِ ذرات آگاہی کی وہ منزل ہے جو صرف قرآنِ کریم کے وسیلے سے نصیب ہوسکتی ہے۔ قرآن حکیم مظاہر قدرت کے عرفان وشعور کی گواہی دیتا ہے۔ ایسا شعور کہ جس کے تحت پتھر سے چشمے پھوٹتے ہیں اور پتھر خشیت اللہ سے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور کنکر دستِ رسولؐ میں آکر تسبیح خوانی کرتے ہیں۔(دوسری طرف بعض قلوب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ پتھر سے بھی سخت)

راغبؔ صاحب نے سیرت کے حوالے سے اخلاقی مضامین کو ایسے ہی سلیقے اور غزل کے لہجے میں کئی اور مقامات پر پیش کیا ہے۔ اس تبصرے کے ابتدائی حصے میں راغبؔ صاحب کی صحتِ عقیدہ کا میں نے ذکر کیا ہے۔ بالخصوص توحید کے باب میں وہ بہت غیور ہیں۔ ذرا اس شعر کی کاٹ ملاحظہ ہو۔

مشکل کشا ہے صرف خدا' بندہ ِ خدا
اس کے سِوا کسی سے گلِ مدعا نہ مانگ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں صحابہ کی شاعری کا عام انداز یہی ہے کہ وہ اسلام کی برکات اور عقائد کے فیوض کا رشتہ ذکرِ رسولؐ سے جوڑتے ہیں۔ میں آج بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہادیٔ برحق کا کوئی مداح ان کے پیغام سے سرسری نہیں گزر سکتا۔ ہاں پیغام کے ساتھ پیغامبر کی ذات وصفات کو مرکزِ خیال بنانا لازم ہے۔

راغبؔ صاحب کی نعتیہ شاعری میں عالم انسانیت پرحضورؐ کے احسانات کا تذکرہ بھی ہے اور اس جمالِ حیات افروز تک پہنچنے کی تمنا بھی۔

راغبؔ نے حبِ دیار نبیؐ میں عشق کے کتنے ہی موسم گزارے ہیں۔ وصال کے موسم بھی اور ہجر کے موسم بھی ......اور ہر موسم میں ان کی کشتِ حبِّ نبیؐ سرسبز رہی ہے۔ ان کی نعت ہی ان کی کشتِ محبت ہے۔

ہر فصل میں ہے کشتِ محبت ہری بھری
ہر موسم دیارِ نبیؐ مجھ کو راس ہے

خدا اس کشتِ محبت کے ماحصل کو اپنی بارانِ رحمت سے ہمیشہ تروتازہ رکھے اور راغبؔ صاحب کا جذبہ جو الفاظ کی قالب میں ڈھلا ہے لوگوں کی زبان پرکلمہ حق کی طرح جاری ہوجائے۔

(مدحتِ خیر البشر/ راغب مرادآبادی،۱۹۷۹ء،ایجوکیشنل پریس ،کراچی)

قصری نے نعتیہ قصیدے کو نقش جلیل بنا دیا ہے

جناب قصری کانپوری سے مجھے ہم وطنی کی نسبت ہے لیکن یہ نسبت مجھے اس سے پہلے ان کے کلام کے بارے میں لکھنے پر نہ اُکسا سکی۔ حالانکہ وہ بہت اچھا شعر کہتے ہیں زبان وبیان کا ایسا لحاظ اور احترام رکھتے ہیں کہ ذوالفقارعلی بخاری ان کی بے غبار زبان کے نہایت درجہ قائل تھے۔ ان کے قطعات وغزلیات کے مجموعے بھی میں نے نہایت شوق سے پڑھے ہیں اور ان کا بانکپن' جوان غزلوں میں نمایاں ہے اور ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ مجھے بے حد عزیز ہے کیونکہ غربت اورعسرت کے عالم میں انہوں نے اپنی ذات کی نگہداشت کی ہے اور کسی کے کرم کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے ہیں اور آج ان کے نعتیہ کلام پر لکھتے ہوئے فخرمحسوس کرتا ہوں' کیونکہ ان کی شاعری کا تعلق اس ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جس نے وطن' رنگ' نسبت اور ہر ایسے ہی امتیاز کی جڑ کاٹ دی۔

نورِ ازل میں تریسٹھ بندوں کے نعتیہ مسدس کے ساتھ چند نعتیں بھی شامل ہیں۔ ترسٹھ بندوں کو حضورؐ کی عمرگرامی سے نسبت ہے اور خدا کرے اس حیاتِ جاوداں کی روشنی کی چھینٹ اس نعتیہ مسدس پر پڑتی رہے۔

مسدس کی صنف کے امکانات کو ہمارے مرثیہ گوشعراء نے دریافت کیا' حالیؔ نے اس صنف کو ماضی کی بازیافت اور حال ومستقبل کی تعمیر کے لئے استعمال کیا۔نعتیہ شاعری کے لئے بھی بعض شاعروں نے ہمارے دور میں مسدس کی صنف کو اپنایا ہے لیکن جناب

قصری کانپوری نے حضورؐ کے نقشِ کفِ پا کے صدقے قصیدے کو مسدس کی آغوش میں سمو کر اسے ایک نقشِ جلیل بنا دیا ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ:

ایک بھی حرف نہیں عرصۂ گویائی میں
آپ کی شان کے شایان رسولِ عربی

لیکن غلامانِ مصطفیٰؐ کا عشق لفظوں کو مسخر کر دیتا ہے۔ ضیا آئینوں میں پڑتی تو نہیں، لیکن ضیائے محمدیؐ لفظوں کو آئینہ بنا دیتی ہے اور ان آئینوں میں انؐ کا عکس زندگی کے نئے مقامات کی راہیں تخلیق کرتا ہے۔

نورِ ازل میں لفظ آئینہ صفت بھی ہیں اور غنچوں کی طرح کھلتے نظر آتے ہیں۔ اس مسدس کو پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ہر نفس معطر ہو گیا ہے۔ ادبی تاریخ کے تناظر میں بات کی جائے تو یہ عرض کروں گا کہ اس مسدس کو اس صنفِ سخن کی توانائی اور امکانات کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

قصری کانپوری بشری حد تک مرتبہ دانِ محمدؐ ہیں کیونکہ حقیقی معانی میں تو اللہ کے سوا رفعتِ محمدیؐ سے کون واقف ہے؟ غالب نے جبھی تو ثنائے خواجہ اسی مرحلے پر آ کر ختم کر دی تھی کہ۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

اور بحمداللہ قصری اس مرتبہ شناسی کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ ''نصف النہار'' اور ''آبشارِ فکر'' کی منزلوں سے گزر کر نورازل کے دیار تک آ پہنچے ہیں۔ ان کی یہ راہِ سفر اور یہ سمت سفری ان کی سعادت کی دلیل ہے۔ اس مسدس کے ہر بند کے پہلے چاروں مصرعوں کے قافیے ایک ایسا سروش بن جاتے ہیں جو کہیں غلط آہنگ نہیں ہوئے اور ٹیپ کے مصرعے جیسے ایک بلندی سے دوسری بلندی تک ہمیں پہنچا

دیتے ہیں۔ یوں ہر بند مقام وذاتِ محمدیؐ کا ایک علیحدہ نظارہ بھی ہے اور یہ سارے بند مل کر ایسی وحدت بن جاتے ہیں جو مقامِ محمدیؐ کا اشاریہ اور انسانیت کے امکانات کا منظر نامہ ہے۔

یہ نعتیہ مجموعہ صفحات کے اعتبار سے تو مختصر ہے مگر اس میں نئی قوت ہے کہ زندگی کے کسی معرکہ میں تھک ہار کر آپ اس سے رجوع کریں گے تو ایک نئی قوت حاصل ہوگی۔ یہ قوت ذکرِ محمدﷺ کی دین اور عطیہ ہے۔

اس مسدس کے مصرعوں میں مجھے کڑی کمان سے چھوڑے ہوئے تیروں کی رفتار اور قوت نظر آتی ہے۔ پھر ذکرِ معراج نے الفاظ کی رفتار میں وہ سرعت عطا کر دی ہے جو کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں، قصری صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ غزل گو کا اصل کمال ارتکاز ہے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزل سے حاصل کردہ اس کمال کا مقصد یہی تھا کہ اسے اس مسدس میں صرف کیا جائے۔

وہ لغزشِ آدم کی تلافی کا سبب ہیں
گفتار میں آیاتِ مقدس کی دمک ہے
کردار میں احکام الٰہی چمک ہے
اطوار میں الطاف وعنایت کی جھلک ہے
سرکار میں رحمت کے تقاضوں کی لچک ہے
وہ رحمتِ عالم ہیں کرم عام ہے ان کا
اور خاصہ خاصانِ رسل نام ہے ان کا
ہر تلخ کلامی کو تبسم سے سزا دی
شعلوں کو زبانِ گل گلزار سکھادی

اس مسدس کا یہی انداز ہے یہ ایک مصرع، ایک بند اور ایک شعر کسی کاوش یا تلاش

کے بغیر اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

اطالیہ کی ایک نومسلم خاتون (جو حقیقی معنوں میں مومنہ ہیں) اور ایک بہت عزیز بزرگ دوست کی اہلیہ محترمہ راشدہ اکرام صدیقی نے ایک دن کہا کہ ''میرا ایمان ہے کہ حضور پر کوئی شخص ایک سطر بھی ان کی رضا کے بغیر نہیں لکھ سکتا۔

اور میں اس مسدس کو حضورؐ کی رضا کا اشارہ سمجھتا ہوں۔ خدا کرے کہ یہ مسدس ہمارے دلوں میں عشقِ محمدیؐ کو چمکائے اور قصریؔ صاحب کی شہرتِ دینوی اور نجاتِ اخروی کا سبب بنے۔

(نورِ ازل/ قصری کانپوری، ۱۹۸۰ء، مکتبہ قصری کانپوری، کراچی)

جمالِ حرم

کوئی پندرہ بیس دن ہوئے میں ساری رات کا جاگا صبح دم کچھ بیداری اور کچھ خواب کے مرحلوں سے گزر رہا تھا کہ بیوی نے اوپر آ کر کہا ''کوئی صاحب آئے ہیں، میں ان سے آپ کی کیفیت بیان نہیں کر سکی، کیونکہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں نسبت خصوصی ہے۔ میں انہیں منع نہیں کر سکی، آپ نیچے جا کر مل لیں۔'' میں نیچے آیا تو دیکھا کہ مسرورؔ کیفی صاحب تشریف فرما ہیں۔ یہ بات میں نے انہیں سنائی تو رونے لگے اور ہچکیاں بندھ گئیں اور اس صبح میں نے اس حقیقت کو محسوس ہی نہیں کیا بلکہ آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کے نعتیہ اشعار، ان کے چہرے کے خدوخال میں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے نسبت کے نشان کی طرح ڈھل گئے ہیں۔

سفرِ حجاز کے بارے میں میرا عقیدہ ہے کہ آدمی صرف اپنے ارادے سے وہاں نہیں پہنچ سکتا بلکہ۔

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

اور یہ اشارہ انہیں کے نصیب میں آتا ہے جو ذکرِ الٰہی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام و درود کو اپنا زادِ سفر جانتے ہیں۔ خدا مغفرت کرے عاشقِ رسولؐ اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؔ نے اس کیفیت اور صداقت کو لفظوں کے دامن میں کیسے سمیٹ لیا ہے

۔

بے مایہ سہی لیکن، شاید وہ بلا بھیجیں!
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

مسرور کیفی کی نعتیہ شاعری نغمۂ وصال اور گریۂ فراق کا عجب مرقع بن گئی ہے۔ وہ بار بار بلائے جاتے ہیں' اور ہر بار نئے نظاروں اور نئے تجربوں سے نوازے جاتے ہیں اور انشاء اللہ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔

ہر لحظہ نیا شوق' نئی برقِ تجلی!
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

مسرور کیفی صاحب کے پہلے نعتیہ مجموعہ چراغِ حرا پر چند سطریں لکھتے ہوئے میں نے ان کی شاعری کے جن امکانات کے مکمل ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا' وہ امکانات اب بفیضِ عشقِ سرکار مدینہؐ ان کے فتوحات کے دائرے میں شامل ہیں۔

چراغِ حرا اور ملجاو ماوا کے بعد جمالِ حرم صرف ایک نئے نعتیہ مجموعہ کا نام نہیں بلکہ نئے اور مانوس تجربوں کی ایک نئی پرت اور سطح کا نام ہے۔

جمالِ حرم کی کئی نعتوں کے لئے مقبول اور مترنم بحروں اور زمینوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ زمینیں ایک اجتماعی تجربہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان تجربوں میں مسرور کیفی نے اپنی آواز کو بھی شامل کردیا ہے۔ یہ امت' امتی اور رسولؐ (مرکز' فرد' جماعت) کے تعلق کی ایک دستاویز ہے۔

مت پوچھئے کہ کیا ہے سرکارؐ کی گلی میں

یہ نعت اس انداز کی نعتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس مجموعے میں کئی ایسی نعتیں ہیں جن کی بحروں میں رکاوٹ اور روانی بیک وقت موجود ہیں۔ اور ان متضاد کیفیات کو الفاظ نے اور ابھارا ہے۔ یوں اب مسرور کیفی کے ہاتھوں ایک نیا آہنگ وجود میں آرہا ہے اور ان کی یہ نغمگی مدینہ منورہ کے تجربات سے ہم آہنگ ہے۔

آنکھوں میں بسیں دل میں سمائے جائیں
منظر وہ مدینے کے دکھائے جائیں
اپنے آقا کے لئے دل میں تڑپ
آنسوؤں کی آنکھ میں سوغات ہے

ان دو عمومی نکات کے اظہار کے بعد جی چاہتا ہے کہ اس مجموعے کے چند ایسے شعر آپ کی خدمت میں پیش کردوں جن میں گہرا تجربۂ ذاتِ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے آپ کو گم کرنے کی تمنا اور کوئی نازک سا مشاہدہ ہو۔ اب تو مسرور کیفی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اپنی زندگی کا سائبان بنایا ہے اور غمِ زمانہ کی دھوپ اس سائباں سے دور رہتی ہے۔

پریشاں حال تو دیکھا نہیں اب تک
درِ خیر الوریٰؐ کا کوئی شیدائی

اسمِ احمدؐ کا اے جہاں والو!
سر پہ رکھتے ہیں سائباں ہم لوگ

اور اسی حقیقت کے اظہار نے انہیں ایک نیا استعارہ عطا کردیا ہے۔ ''نام محمدؐ کا شجر'' قرآنِ حکیم نے کلمہ طیبہ کے لئے شجر کا استعارہ ہی استعمال کیا ہے۔

گر سایہ کناں نامِ محمدؐ کا شجر ہو
پھر خوف مجھے ہو نہ کسی بات کا ڈر ہو

اب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسرور کیفی کے شخصی رشتہ میں حضورؐ کی کائنات ساز اور تاریخ ساز شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کا احساس بھی ابھر رہا ہے۔ حضورؐ کی نسبت سے وہ مسلمانوں کو جو باتیں یاد دلا رہے ہیں اس میں واعظ کی پیشہ ورانہ سطحیت

نہیں، بلکہ شاعرانہ تجربہ کی سچائی اور روح کی بے تابی شامل ہے۔

ذرے ذرے کو بنایا آفتاب
میرے آقا کی بھلا کیابات ہے
کونین کے مالک کے غلاموں کو خبردو
کونین کے مالک کی غذانانِ جویں ہے

اب حضورؐ کا اتباع اور ان کی رفاقت مسرورؔ کیفی کی زندگی کا ماحصل اور خلاصہ ہے۔

رنگ چن چن کے راہ بطحا سے
خود بناتے ہیں کہکشاں ہم لوگ
محو خرام کون تھا خوش رنگیوں کے ساتھ
قدموں کے، میرے دل پہ نشاں رات بھر رہے

''رات بھر رہے'' اس نعت نے مجھے خسروؒ کی مشہور نعت یاد دلا دی۔

محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

اور ''خوش رنگیوں'' کے ٹکڑے میں جہانِ معانی سمٹ آیا ہے۔ قرآن عظیم نے ''صبغتہ اللہ'' (اللہ کے رنگ) کو سب سے اچھا رنگ قرار دیا ہے۔ اللہ کا رنگ اس کے اسمائے حسنیٰ یعنی صفات الٰہی سے عبارت ہے۔ اوران صفات الٰہی کی جھلک حدِ بشریت میں بدرجۂ کمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں موجود ہے، وہ ذات جسے کتاب عظیم نے ''رؤف رحیم'' قرار دیا ہے۔

مسرور نے کہا ہے۔

آجاتی ہے مسرورؔ نظر دور سے مجھ کو
خاکِ درِ سرکارؐ کی حامل جوجبیں ہے

اور ہم جیسے کم نظروں کو بھی جبین مسرور پر خاکِ درِ سرکارؐ کے ذروں کی چمک نظر

آجاتی ہے۔ ان کی نعتوں میں بھی یہی چمک ہے۔ اس بار وہ جمالِ حرم کا تحفہ لئے درِ سرکارؐ پر حاضری دینے جارہے ہیں۔ کاش وہاں اس فقیر اور اس کے خاندان والوں کی یاد ان کے دل میں رہے۔ اور ہمارے حق میں کلماتِ دعا ادا کئے جائیں۔

(جمالِ حرم/مسرور کیفی، جون ۱۹۸۱ء، ادارۂ فروغِ ادب، کراچی)

ثنائے حبیب

مدتوں پہلے پیامؔی صاحب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں لیکن فون پر گفتگو کے دوران میں انہیں یاد کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اب جو وہ ملاقات کے لئے تشریف لائے تو ماضی کے وہ لمحے ذہن میں جاگ اٹھے' لیکن ایک اعتبار سے یہ ملاقات پہلی ملاقات ہے۔ مجھے ان کی نعت گوئی کا علم نہ تھا۔ تعارف کا یہ عنوان خود ہی ایک سعادت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کا تعلق کثیر الجہتی ہے اور طرح طرح سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ کبھی خاموشی کے ذریعے' کبھی گریۂ گلوگیر کے ذریعے' کبھی حرف وآواز کے ذریعے......یوں بعض اظہار شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں اور بعض اظہار ایسے کہ دوسرے بھی شریکِ تجربہ ہوجاتے ہیں۔ نعت گوئی بھی ایسا ہی اظہار ہے۔

میں نے پیامی صاحب کی چند نعتیں پڑھیں۔ ان میں ہر لفظ کے پیچھے شوق وذوق کی ایک دنیا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی تمنا ہے اور اظہار میں حددرجہ احتیاط ہے۔ اس احتیاط کا سبب پیامی صاحب کے ہم وطن شاعر اور جدید اردو غزل کے ایک ستون حضرت جگر مراد آبادی اپنے اس زندہ مصرعے میں بیان کرچکے ہیں۔

نازک ہے بہت غیرتِ سلطانِ مدینہ

جناب پیامؔی کی نعتوں میں مرتبہ نبی اکرم واعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادراک وعرفان پوری طرح موجود ہے۔

کیا اپنے ذکر کے ساتھ ہی جو نبیؐ کے ذکر کو سربلند
یہ خدا کی ان پہ نوازشیں' یہ خدا کا لطفِ تمام ہے

جناب پیامؔی کی نعتیں ان کے دل کی دھڑکنوں سے عبارت ہیں' لیکن حضورؐ کا ذکرتو ذہن میں بھی نئے دریچے کھولتا ہے اس لئے ان نعتوں میں فکری پہلو بھی موجود ہے۔

حق بیاں' حق نما' حق نگر آپؐ ہیں
ہرزماں کے لئے راہ برآپؐ ہیں

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ذاتِ ختم المرسلین سے قربت آدمی کو خوف وحزن پر غالب کردیتی ہے۔ اس ذات کا پرتو ہماری سیرت کو بدل دیتا ہے۔ جبھی تو فرمایا گیا ہے۔

''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنہ''

سرکارؐ سے نسبت ہے مجھ سے نہ ملا آنکھیں
اے گردشِ دوراں تو مجھ کو نہ دکھا آنکھیں

اور اسی عشق کے تقاضے کے تحت پیامؔی صاحب اپنی نعتیں ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کررہے ہیں۔ انہیں تو اتنی تاخیر گوارا نہیں کہ نعتوں کی تعداد میں اضافہ کرکے کوئی ضخیم نعتیہ مجموعہ شائع کریں۔ خدا انہیں اتنی عمر اور موقع دے کہ ان کا ایک بڑا نعتیہ مجموعہ شائع ہوسکے' اور اس مختصر مجموعے کو بارگاہِ رب العزت اور درگاہِ رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شرفِ قبول حاصل ہو۔

(ثنائے حبیب/ پیامی مراد آبادی، ۱۹۸۳ء، مشہور آفسٹ پریس، کراچی)

پہلی کرن آخری روشنی

اعجاز مصطفیٰ کی تقریب کتاب نمائی کے سلسلہ میں مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ نعت کے کسی مجموعہ کی تقریب میں شرکت ہی سعادت ہے اور کچھ کہنے کے موقع کا حصول لطیفۂ غیبی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے زندگی کے ہر باب میں میری حیثیت سے کہیں بڑھ کرنوازا ہے لیکن اس کی نوازشوں میں سب سے بڑی نوازش یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے مواقع میری زبان اور قلم کے لئے جیسے تراشے جاتے ہیں۔

اعجاز رحمانی صاحب سے میرا تعارف اعجاز مصطفیٰ کے حوالے سے ہوااور میرا ان کا رشتہ ان کے اس شعر کی بنیاد پر استوار ہے۔

میری عسرت کو ہے نسبت ایک ایسے شخص سے
جس کے دامانِ تہی میں دولت کونین ہے

نعت کا یہ انتہائی خوبصورت اور موثر شعر' ایک عجب لسانی تجربہ ہے ''شخص' دامانِ تہی'' بھلا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی سے ان لفظوں کو کیا نسبت' لیکن ''ایک ایسے'' اور ''دولتِ کونین'' کی پیوند کاری نے ایک نیا اور بالکل مختلف لسانی سیاق وسباق تخلیق کردیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فقرِ رسولؐ دامانِ تہی کی جگہ اس کائنات کے واسطے دامان رحمت بن جاتا ہے۔ زبان کی یہ تسخیر' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی مرہونِ منت ہے۔

اعجاز مصطفیٰ کی نعتوں میں اردو نعت گوئی کی روایات کے التزام کے ساتھ ساتھ

ایک بے قرار روح کی تڑپ اور بے چینی کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو دامانِ رسولؐ کی خوشبو ہرغم سے فراغ کی ضمانت ہے اور دوسری طرف عہد حاضر کی زندگی کے تضادات اور آج کے انسان کا المیۂ اس مثالی انسان کے کردار وحیات سے رجوع کی دعوت ہے اعجاز رحمانی کی یہ آرزومندی ان کے مومن قلب کا اشاریہ ہے کہ وہ اپنے عہد کو تعلیمات محمدیؐ کے قالب میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی آرزو مندی نے انہیں ۱۹۷۷ء میں نظام مصطفیٰ کی تحریک کا مغنی بنا دیا تھا۔ اس دورِ استبداد وآزمائش میں انہوں نے اپنی، شعلہ نوائی سے ہرنقشِ باطل کو جلانے کی کوشش کی۔ یہ وہ دور تھا کہ میر صاحب کے لفظوں میں۔

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ درودیوار کرے ہے

یہ معرکۂ حق وباطل یامعرکۂ روح وبدن آج بھی جاری ہے۔ اس معرکہ کو دیکھ کر ہمارے لبوں پر مایوسی کے عالم میں یہ لے ابھرنے لگتی ہے کہ

قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں

لیکن شاید ہمارے معیار اور پیمانے فتح وشکست کو اہمیت دیتے ہیں کیونکہ قافلہ حجاز اب ایسا بے نوا بھی نہیں کہ اس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام کی خاطر گردن کٹوانے والے نہ ہوں۔

شہ بطحاؐ کا پیروکار ہوں میں
برائی کے لئے تلوار ہوں میں
بہت مضبوط ہے ایمان میرا
مقابل کفر کے دیوار ہوں میں

جن کو نسبت حضورؐ سے ہوگی
وہ زمیں پر بھی آسماں ہوں گے

جتنے بھی ہیں ''ازم'' جہاں کے ان سب کو ناکام کرو
دل میں اگر ہے حبِ محمدؐ درسِ محمدؐ عام کرو

نظام اسلام کا رائج کرو اعجاز دنیا میں
اسی میں راز پوشیدہ ہے انسانوں کی عظمت کا

اردو میں نعت گوئی حالؔی سے پہلے بنیادی طور پر اپنے ذاتی جذبۂ محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور جذب وسرور کی ایک دستاویز تھی۔ حالؔی نے اجتماعی زندگی سے اس کا پیوند لگایا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے مسلمان زوال اور غلامی کے ایک نئے دور سے گزر رہے تھے اس دور میں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہر نظام کے لئے مشہور اور محسوس علامتوں اور مرکزوں کی کسی حد تک ضرورت ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ اور گنبد خضریٰ ایسی ہی علامتیں بن گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حیثیت ابھر کر نئے انداز سے سامنے آئی کہ وہ مے خانہ ملت کے ساقی ہیں۔ وہ مسلم اول بھی ہیں اور مسلمانوں کو ملت بنانے والے بھی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے قیام کے ذریعے ہمیں یہ بتایا کہ اسلام پر انفرادی طور پر عمل، پوری طرح ممکن ہی نہیں اور مدینہ کی ریاست، بعد کی مسلمان نسلوں کے لئے وہ فردوسِ گم گشتہ بن گئی جو ہمارے خونِ جگر میں ہمیشہ پنہاں رہی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر ابھری ہماری منافقت نے اللہ کے اس انعام کے خدخال کس طرح بدلے اسے ہم سے بہتر اور کون جانتا ہے۔ وہ کلمہ طیبہ جس کی جڑیں قلب مومن میں ہوتی ہیں، اور شاخیں عرشِ الٰہی تک پہنچتی ہیں، ہماری بد اعمالیوں سے مرجھا گیا اور کشتِ دل میں زقوم کے پودے ہی پودے اگ

آئے۔ اعجاز رحمانی ایسی صورتِ حال کا شاعر ہے اور اس نے اسمِ محمدؐ کو اسمِ اعظم بنا کر، اور اپنے آنسوؤں کو لفظوں کا پیکر دے کر انہیں زقوم کے پودوں کو جڑ سے کھودنے کو نعت گوئی کا ایک روپ سمجھا ہے۔ بعض صاحبان کو نعت گوئی کی روایات اور اردو زبان کے پیش نظر ''ازم'' اور ایسے ہی دوسرے بعض نئی اصطلاحوں کے استعمال پر اعتراض ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی ہماری طرح ایک نامیاتی وجود رکھتی ہے۔ یہ بدلتی ہے، پھیلتی ہے، اور توسیع کو بگاڑ کا عمل قرار دینے والے اپنی رائے کو زبان کے مزاج اور تاریخ پر فوقیت دیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔

پہلی کرن، آخری روشنی، اعجاز رحمانی کے اسی دورِ جہاد کی نعتوں کا مجموعہ ہے اس مجموعہ کے شاعر کے بارے میں چند اشارات اس تحریر کے آغاز میں کر چکا ہوں۔ نظام اسلام کی جدوجہد میں حصہ لینے والا یہ شاعر مزدور بھی ہے (ہمارے عہد میں اب مزدوروں کو کامگار اور محنت کش کہا جانے لگا ہے۔ یہ بھی احساسِ کمتری کا ایک لسانی اظہار ہے۔ آدمی اپنے آپ کو حقیر سمجھے تو اس کی شناخت کے جو الفاظ استعمال ہوں گے۔ وہ سبھی حقیر ہو جائیں گے) اور اس نے محنت کی عظمت تک سیدابرار کے توسط سے رسائی حاصل کی ہے۔

آج تک آپؐ کے پسینے سے
جل رہا ہے چراغ محنت کا

یہ اعجاز رحمانی کی شخصیت کا ایک پہلو ہے، اسی پہلو کا تقاضا یہ تھا کہ وہ معاشرہ کی اصلاح کو عملی طور پر اپنائیں، بلدیہ کراچی کی کونسلری ان کے لئے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔

اس جذبۂ حب نبی اور تقلیدِ سنتِ نبوی کے ساتھ ساتھ اعجاز رحمانی کو خدائے محمد نے وہ شعور نغمہ اور آہنگ عطا کیا ہے جو ان کی نعتوں میں ہر جگہ سنائی دیتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اردو نعت گوئی کی روایت ان کے سامنے ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ حضور

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا ذاتی تعلق ایسا واضح ہے کہ اسے محبت کی اعلیٰ ترین اور ارفع ترین سطح کہہ لیجئے۔ ان کا ذوقِ عمل اور شعور نغمہ اسی محبت کا نتیجہ ہے۔ محبت(ح۔ب۔ب) کے معانی میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ اس کے معانی ہیں سفیدی، صفائی، بلندی، کسی چیز کو مضبوط پکڑنا، اور عملاً اتباع کرنے کے لئے ہیں۔ اس کے معنوں میں حفاظت بھی شامل ہے، حب الماء مشک یا مٹکے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں پانی کی حفاظت کی جاتی ہے حب اور محبت، اپنی ضرورتوں کی نکاس کے لئے بھی ہوسکتی ہے اور اپنی ذات کی تکمیل کے لئے بھی۔ حب نبی، ایک بلندمعنوی حقیقت ہے۔ یہ وہ محبت ہے جونورمجسم کی نسبت سے سفیدی وصفائی کی علامت ہے بلندی وآغوش ہے اور ہماری ذات کی تکمیل کرتی ہے۔ یہی محبت اعجاز رحمانی کی نعتوں میں سرور قلب اور نغمہ روح بن کر ابھری ہے۔ آج نعت گوئی پر جیسی توجہ دی جارہی ہے، غالباً ہماری ادبی تاریخ کے کسی دور میں نہیں دی گئی۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہم اپنے ویران ویران دلوں کو اس ویرانے اور ظلمت کدے میں لے کر جب روشنی، خوشبو اور سرسبزی کی تلاش میں نکلے تو دیار رسالت تک پہنچ گئے، لیکن آج کے بہت سے نعت گوشعرا کے ہاں دل اور ذہن کی یہ ہم آہنگی نہیں ملتی۔ نعت کے میدان میں مضمون آفرینی سے کام نہیں بنتا اس کے لئے دل اور اس کے مطالبوں کو غلامی رسول میں دینا پڑتا ہے اور پھر آگاہی کی اس منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کرنی ہوتی ہے جس پر پہنچ کر منصبِ رسالت کے مفاہیم دل ونظر کی متاع بن جائیں۔

ثنائے شفیعِ اممؐ لکھ رہا ہوں
میں تاریخِ لوح و قلم لکھ رہا ہوں
میں جتنا بھی لکھتا ہوں شانِ نبی میں
یہ محسوس ہوتا ہے کم لکھ رہا ہوں

خدا میرا روئے سخن جانتا ہے
کسے محتشمؐ محترم لکھ رہا ہوں

تاریخِ لوح وقلم، ذکرِ محمدؐ ہی سے عبارت ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بڑے عظیم انبیا مبعوث ہوئے۔ ان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارے درود میں ان کے جدا مجد کی حیثیت سے شامل ہیں۔ وہ ابراہیم جنہیں قرآن حکیم نے ''امته قانتالله حنیفا'' قرار دیا ہے لیکن یہ سارے جلیل القدر نبی، حضور ختم المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے طائرانِ پیش رس تھے۔ اور اب ان سب کی نبوتیں تایوم الدین نبوتِ محمدیؐ میں گم ہوگئیں۔ پھر اس حقیقت کو بھی نظر میں رکھئے کہ جو اس مجموعہ کے نام سے آشکار ہے۔ پہلی کرن آخری روشنی، اور پھر یہ حقیقت کہ قرآن حکیم لوحِ محفوظ پر ثبت کردیا گیا اور ذکر محمد، کلام اللہ کا عنوانِ جلی ہے ۔ یہی بات ایک دوسرے رخ سے اعجاز رحمانی نے یوں کہی ہے۔

کتنی صدیوں سے تھا انتظار آپؐ کا
اس زمانے کو کتنے زمانے لگے

پہلی کرن آخری روشنی، نعتوں کاایک مجموعہ ہے جس کو بے ساختہ طیف نور(Spectrum) کہنے کو دل چاہتا ہے۔ یہ رنگوں کا ایک دائرہ یا قوسِ قزح ہے آپ اس مجموعہ کا مطالعہ کرکے اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ میں حصولِ سعادت کے لئے چند مزید اشارات پیش کرتا ہوں۔

اس مجموعہ کی نعتوں کے لئے غزل کی ہیئت چنی گئی ہے۔ ایک مختصر قصیدہ ضرور شامل ہے مگر ادنیٰ اختلاف کے ساتھ غزل اور قصیدہ کی ہیئت اور پیکر میں فرق نہیں۔

غزل کے فارم کے انتخاب کے باوجود آپ یقیناً محسوس فرمائیں گے کہ کئی نعتیں تسلسل رکھتی ہیں ان میں غزل مسلسل کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔

(۱)۔ یہ کس کا در ہے' یہ کس کی گلی ہے

(۲)۔ کب بلاتے ہیں شاہِ اممؐ دیکھئے

(۳)۔ ابتدا سے چلتے چلتے انتہا تک آ گئے

انہوں نے اردو غزل کی ایک روایت کو شعوری طور پر برتا ہے کس طرح ان کی نعتوں میں بعض مشہور شعروں کی صدائے بازگشت' نئی بلندیوں پر گونجتی نظر آتی ہے۔ اس شعر کو بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔

حسن اس شان سے چلتا ہے خدا ہو جیسے
زیرِ پا چاند ستاروں کی ردا ہو جیسے

یہ خیال اعجاز رحمانی کے نعتیہ شعروں میں نئے انداز سے اپنے آپ کو دہراتا ہے لیکن حسن کا یہ مرتبہ' محمدؐ کے غلاموں کا مرتبہ بن جاتا ہے۔

اس وقت بھی ہونٹوں پہ محمدؐ کی ثنا ہو
جب زیرِ قدم چاند ستاروں کی ردا ہو
مانگتا ہوں میں خاکِ درِ مصطفیٰ
چاند تاروں کی کس کو ردا چاہئے

غزل کی کئی اور علامتیں اور روایتی تصور' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے' ایک نئی بلندی کے حامل بن گئے ہیں۔ مثلاً پھولوں کا تبسم' زخم' چاک گریبانی ایک روایتی تصور ہے' لیکن یہ شعر ایک نیا تصور اور خیال بن کر ابھرا ہے۔

حضورؐ آئیں تو سب زخم مندمل ہوجائیں
یہ پھول کب سے تبسم کا بار اٹھائے ہیں۔

چند ایسے اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جن میں غزل کی علامتیں نئے سیاق وسباق کا آئینہ بن گئی ہیں۔

ہونٹوں پہ ہے میرے شبِ اسریٰ کی حکایت
کچھ دیر کو اے گردشِ ایام ٹھہر بھی
چمن میں آمد خیر الوریٰؐ کی جب خبر پائی
پئے تعظیم خوشبو پھول سے باہر نکل آئی
آئینہ خانے کی حد میں کس نے رکھا ہے قدم
جل اٹھے ہیں آئینہ خانے میں حیرت کے چراغ

پہلی کرن آخری روشنی' اس کا ذکر ہے جس کی زندگی کے ہر لمحے میں حسن لامحدود کی صفات اس آئینہ خانہ زمان ومکان کی حدود میں ابھر کر سامنے آئیں۔ صفاتِ الٰہیہ کی جھلک حضورؐ کی زندگی میں بحدِ بشریت انتہائی مکمل شکل میں نظر آتی ہے۔ حضورؐ اخلاقِ الٰہی کا مظہر ہیں اور یہی سب سے اچھا رنگ ہے جس میں ہمیں اپنے آپ کو رنگنا ہے کیونکہ یہی ہماری معراج ہے۔ جنہوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا وہ تاریخِ انسانی کے سمت نما بن گئے۔

اسؐ کی راہ پہ چلنے والے سورج بن کر ابھرے ہیں
سنگ زنوں کو جس کی سیرت آئینہ کردار کرے

اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمارے مستقبل کی تعمیر کرسکتا ہے۔

(پہلی کرن آخری روشنی/ اعجاز رحمانی، ۱۹۸۲ء، عالمگیر پبلیکیشنز، کراچی)

سرکارؐ کی چاہت والا

سرسید کی ریش دراز کی سپیدی کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شبلی نے کہا۔

چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی

اور میں سحر کی یہ چھٹکی ہوئی چاندنی گزشتہ تیس سال سے اپنے ایک محترم دوست اور پیار کرنے والے بھائی کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ یہ آدمی ایک طفیلی سیارہ ہے۔ چہرے کے خدوخال میں کھلنے والی یہ چاندنی تو اس بات کا اعلانِ جلی ہے کہ

بڑا رتبہ ہے عشاقِ نبیؐ کا

اس آدمی نے حواریٔ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم، یعنی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دی تو صاحبِ مزار نے ان الفاظ میں اس کا استقبال کیا:

السلام علیک ابنِ رسول اللہ

یہ آواز اس آدمی کے کانوں کے ذریعے اس کے وجود کی گہرائیوں میں داخل ہوئی اور آواز بازگشت بن کر یوں بکھری اور برسی کہ آج تک وادی ذات میں گونج رہی ہے۔ اس آدمی کو لوگ گراں گوش سمجھتے ہیں، حالانکہ بات یہ ہے کہ اگر کسی مجمع میں کچھ لوگ ایک دوسرے سے باتوں میں گم ہوں تو یہ سن نہیں پاتا لیکن اگر کوئی شخص اس سے مخاطب ہو کر صرف اس سے بات کرے تو ہلکی سی آواز کو بھی اس کی سماعت اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے آپ سے کہی کہ آپ حواریٔ رسول کے التفاتِ شخصی اور

خطابِ خاص کی کہانی سے آشنا ہوسکیں۔

اس آدمی کو مدتوں یہ خیال ستاتا رہا کہ کہیں یہ ماجرا اور تجربہ کوئی وسوسہ تو نہیں ہے اور پھر یہ اس دیار میں پہنچا کہ جہاں وقت اور شیطان دونوں شہر کی فصیل سے باہر گریہ کناں رہتے ہیں۔ وہ شہر جس کی گلیاں خدا آشنا ہیں۔ حرمِ مصطفیٰؐ میں روضۃ من ریاض الجنۃ میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے آنکھوں پر نیند نازل ہوئی۔ وہ نیند جو ''سکینہ'' ہے اور پھر اس آدمی نے دیکھا کہ سرکارؐ، شیخینؓ کی معیت میں حجرہ مبارک سے باہر تشریف لے آئے ہیں اور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ حضرت شیخ عمر شہاب الدین سہروردیؒ اور حضرت باغ اجمیریؒ بھی ریاض الجنتہ کی طرف کھلنے والے دروازہ سے داخل ہوئے۔ سرورِ کائناتؐ سے مواجہ شریف کی جالی کے اندر ہی قدرے دہنی سمت نماز کی امامت فرمائی اوراس آدمی نے دوسری صف میں حضرت شیخ جیلانیؒ کے پیچھے کھڑے ہو کر ہادی برحقؐ کی امامت میں نماز ادا کی۔ آنکھ کھلی تو روضۃ الجنتہ میں بیٹھے ہوئے اس آدمی کے ہاتھوں میں قرآن حکیم کا نسخہ تھا اور قرآنِ ناطق کا روضہ سامنے تھا۔ سرکارؐ جس خواب میں آئیں وہ خواب بیداریوں کی بیداری ہوتا ہے۔ وسواس وظن وگمان سے بالاتر اور اس بات کو سمجھنا اوراس کی صداقت پر ایمان لانا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ:

غلامانِ محمد کی بڑی توقیر ہے لوگو!

اور

میں بھی منجملہ اربابِ حضوری ہوں جمیلؔ

چودہ صدیوں میں ہم اتنے بدل گئے ہیں کہ اگر قرنِ اول کے مسلمان اس عہد میں آجائیں تو وہ ہمیں بے دین سمجھیں اور ہم انہیں مجنون قرار دیں۔ (معاذ اللہ) لیکن ہمارے اور ان کے درمیان اگر کوئی قدرِ مشترک نکلے گی تو وہ حضورؐ کی محبت ہوگی۔ ''محمدؐ'' یہ نام چودہ سو سال کی مدت اور عہدِ حاضر کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسجدِ نبوی میں

اپنے اولین تاثرات کو میں نے لفظوں کی گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی۔ اس سعی رائیگاں کو نقل کرتا ہوں۔

''اپنے آپ کو مسجد نبوی کے روبرو پایا۔اب میں آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور اس آئینے میں میرے مقابل تمام داغِ عیوب برہنگی تھے۔ اپنی زندگی کی ہر شکن میرے سامنے تھی۔ میری نگاہیں جھک گئیں' ہمت کر کے پھر نگاہیں آئینے کی سمت اٹھائیں' اس آئینے میں میرے سارے داغ موجود تھے اور ان داغوں کے درمیان میرا دل تھا۔ سیاہ......ہوسِ لالہ رُخاں سے داغ داغ......مگر ان داغوں کے درمیان ایک روشن نقطہ تھا' دیکھتے دیکھتے یہ نقطہ بڑھتا گیا۔ روشن تر ہوتا گیا' داغ مدھم پڑ گئے اور مجھے خودبخود معلوم ہوگیا کہ یہ عشقِ محمدؐ کا وہ نقش تھا جو ہر مسلمان کی طرح میرے دل میں بھی موجود تھا' اور جسے مسجدِ نبوی کے آئینے نے مہر صفت بنادیا اور آئینے نے مہر صفت دل بلکہ مہر درخشاں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔''

کہنا یہ مقصود تھا کہ سرکارؐ سے چاہت والے تو ہم سب ہیں جمیلؔ نقوی سرکارؐ کی چاہت والے ہیں۔ انہیں سرکار کی محبت عطا ہوگئی ہے اور ان کی نعت گوئی ان کی حضوری کی داستان ہے۔

......۲......

ہمارے دور میں خارجی کائنات میں تغیر وتبدل اور انسان کے ہاتھوں تسخیر فطرت کا عمل اتنا تیز ہوگیا ہے کہ دنیا ایک ایسا آتش فشاں بن گئی ہے جس کا لاوا کسی بھی لمحے جھلس سکتا ہے۔ جلا سکتا ہے' دوسری طرف آدمی اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہے' اس صورت حال میں جب:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

انسان اپنی شیرازہ بندی کے لئے مختلف نظاموں کا رخ کرتا ہے' لیکن اپنے اس

سفر کے تھکا دینے والے مرحلوں کے بعد اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

ان نظاموں کے نقص اور ناتمامی کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ایسی شخصیت اور ذات وابستہ نہیں جو ایک طرف حیات اجتماعیہ کی ترتیب وتشکیل کے سلسلہ میں رہنما بن سکے اور دوسری طرف ہم پر ہماری ذات کی راہوں کو کھول دے۔ کوئی شخص کتنا ہی تجریدی ذہن کیوں نہ رکھتا ہو' یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنے تصورات کو کسی پیکر میں نہ دیکھنا چاہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو یہی امتیاز حاصل ہے۔ یہاں ایک نظام سمٹ کر ایک ذات بن جاتی ہے او رایک ذات پھیل کر ایک نظام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے اقبال نے ایک مصرع میں بیان کیا اور ہم نے اس تناظر میں پوری طرح نہیں سمجھا۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

ہمیں اقوامِ غرب نے جب ''محمڈن'' کہا تو ہم نے اسے قبول نہیں کیا۔ مسئلہ اس لفظ کا نہیں تھا بلکہ اس نقطہ نظر کا تھا جس کے تحت ہمیں محمڈن کہا گیا۔ اس لفظ کے خلاف ردعمل کا دور ختم ہوا تو اب یہ بات سامنے آئی کہ مسلم ہمارا نام ہے اور مصطفوی ہماری صفت ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی اسی مرکزیت نے انہیں ہماری شناخت بنادیا اوران سے ہر مسلمان کا ایسا شخصی اور ذاتی تعلق پیدا کر دیا جس کی کوئی نظیر نہیں مل سکتی۔ حضور ایک زندہ حقیقت اور وجود کی طرح ہم میں سے ہر ایک کے دل میں دھڑک رہے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت ''یا محمدؐ'' اور ''یارسول اللہؐ'' کا وہ نعرہ مستانہ ہے جو ہجومِ مصائب میں ہماری روح بلند کرتی ہے اور ہر حلقۂ ستم کو توڑ دیتی ہے۔

ہمارے عہد میں نعت گوئی کو نئی سمتیں اور نئی گہرائی حاصل ہوئی ہے۔ بزرگوں

کااحترام سرآنکھوں پر مگر شہیدیؔ، امیر مینائیؔ اور محسن کاکوروی کے علاوہ مشکل ہی سے ایسے شاعر ماضی میں نظر آئیں گے جن کے ہاں نعت رسم سے آگے کی چیز ہو۔ ہاں جب مصائب وآلام اور رنج ومحن کا سورج ہماری زندگی کے مطلع پر ابھراتو ہمیں ایک سائبان کی ضرورت پڑی اور ذاتِ محمدیؐ یہ سائبان بن گئی۔ یہ دور حالیؔ سے شروع ہوتا ہے ۔

اے خاصۂ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

اس نعت گوئی کاارتقاء میرا موضوع نہیں۔لیکن اردو نعت گوئی کے سفر کی چند منزلوں کی طرف اشارہ کیے بغیر ہم آج کے نعت گو اور نعت گوئی کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے۔

اقبال کے اردو کلام میں رسمی اور اصطلاحی معانی میں کوئی نعت موجود نہیں لیکن اقبال ہر شے کو حضورؐ کے حوالے سے اور حضورؐ کو ہر شے کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ یہ مرکز دائرہ دین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا۔دوہرا سفر ہے۔مولانا محمد علیؔ، ظفر علی خان، حسرت موہانی ، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور ان کے دوسرے اہم ہم عصروں کے ہاں نعت گوئی رسم نہ رہی۔ وارداتِ شخصی اوراستغاثہ ملّی بن گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ بڑے گہرے اورلطیف نکات ان شعراء کی گرفت میں آگئے۔ یہ ایسی عطا ہے کہ ربِ جلیل نے فقیہ شہر کو اس سے محروم رکھا۔ مثال کے طور پر بلاتبصرہ اصغر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادا و رسمِ بلالی و طرز بو لہبی

قیام پاکستان کی صورت میں اللہ رب العزت نے ہمیں یہ موقع عطا کیا کہ ہم اپنی تاریخ کے کھوئے ہوئے تسلسل کو پالیں لیکن ہوا یوں کہ اسلام کو ہم نے ٹکڑے ٹکڑے کرکے بہت سے نظاموں میں تقسیم کردیا۔ نتیجہ معلوم،اسلام، اسلامی نظریہ بن گیا۔ احیائے دین کا جذبہ تحریکِ اسلامی کے نام سے موسوم ہوا۔ شوریٰ کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا

گیا۔ مجھے غلط نہ سمجھئے میں اسلام کو اپنی اجتماعی زندگی کی صورت اوراسلام کو ملّت کا مقدر جانتا ہوں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ حضورؐ سے بچھڑ کر ہم مغربی اصطلاحوں اور طریق کار کے اسیر بن گئے۔

مگر اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب ہمارے ذہن اوردل کا رخ سمتِ کعبہ اورسمت مدینہ ہے۔فکر کی تبدیلی سے زیادہ اہم بات ہمارے جذبہ کی ''قبلہ مدینہ سمتی'' اور جذبہ وفکر کا امتزاج ہے۔ اب ذاتِ رسالتؐ ہمارا حوالہ بن گئی ہے۔موجودہ دور میں جو نعتیہ شاعری تخلیق ہورہی ہے، وہ ماضی کی نعتیہ شاعری سے مختلف، زیادہ سچی اور گہری ہے۔ اتنے نعتیہ مجموعے پہلے کبھی شائع نہیں ہوئے۔ ان نعتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کا ادراک ہے، مگر بہت سے شعراء کے ہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے ذاتِ رسالت مآب کو بھی حصوں میں تقسیم کرکے ایک حصے کو اپنالیا ہے۔ سرورعالمؐ کی ذات کی عظمت کاپورا احاطہ وادراک ممکن نہ سہی لیکن اس کی سعی وکاوش کرنے والے شعراء میں عبدالعزیز خالدؔ اور چند دوسرے شعراء کے بعد اب جمیلؔ نقوی اپنے اس مجموعے کی اشاعت کے بعد امتیازی طور پر شامل ہوجائیں گے۔

اس نقطہ کی قدرے وضاحت ضروری ہے۔ سرکارِ دوعالمؐ کے پیغام اور انسانیت پر احسانات کاادراک ہمارے اس دور میں غیر مسلموں کے لئے بھی آسان ہوگیا ہے۔ یہ گردشِ ماہ وسال کا کرشمہ ہے جس نے اسمِ محمدؐ اور کارِ محمدؐ کو چمکا دیا ہے۔لیکن بعض نقادوں اور شاعروں کا یہ قول میری سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ آج کی نعت گوئی مقام محمدیؐ کے ذکر سے عبارت ہے۔ اب تذکرۂ زلف ورخسار کا دور بیت گیا۔یہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف میدانِ بدر واحد ہی نقوشِ رسالت کا نام نہیں، غار حرا کی خلوت بھی تو وہ نقش رسالت ہے جو چراغِ خداوندی کی صورت روشن ہے۔ اپنی ہی دعائے نصرت پر آمین کہنے والی تیغِ محمدیؐ ، اس سجدے سے کس طرح الگ کی جاسکتی ہے جو میدانِ بدر میں

نصرتِ الٰہی کی طلب کی خاطر کیا گیا تھا۔ میں صدیوں کی دوری پر کھڑا اپنی بیداریوں اور خوابوں میں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ وہ رخسار کیسے تھے جن میں صحابہ کرام کو سورج تیرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

''میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا۔ گویا آپؐ کے رخسار مبارک میں سورج تیر رہا تھا۔ جب آپؐ مسکراتے تو دیواروں پر اس تبسم کی چمک پڑتی تھی۔'' (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ)

اور وہ جسم کیسا تھا جو خوشبوؤں کا سرچشمہ تھا۔ وہ خوشبو جو دوسروں کو یوں سرفراز فرماتی کہ اس کے جسم کو اپنا مسکن بنالیتی۔

''آپؐ کسی سے مصافحہ فرماتے تو تمام دن اس مصافحہ کی خوشبو اس شخص کے ساتھ رہتی' کسی بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے تو دستِ رسالت کی خوشبو کے سبب وہ بچہ دوسرے بچوں میں الگ پہچانا جاتا' آپ کسی راستے سے گزرتے تو راستہ میں بکھری اور قائم خوشبو سے معلوم ہوجاتا کہ آپ اس راستے سے تشریف لے گئے ہیں۔(حضرت انس رضی اللہ عنہ)

اور وہ زلفیں کیسی تھیں کہ ''والیل'' کے پردے میں جن کی قسم کھائی گئی۔

جمیلؔ نقوی کی نعتوں میں اس حسن کی جھلک ہے جو ان کے لئے صرف شنید نہیں بلکہ دید بھی ہے۔اپنی محبت اور جذبے کا عکسِ جمیل ہۓ منصب رسالت کی آگاہی ہے۔ عہدِ حاضر پر حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سائبان صفت سائے کا بیان ہے۔مختصر یہ کہ اس مختصر مجموعے کا تنوع' عالمِ شوق کی طلسم سامانی کا مظہر ہے۔ ہاں یہ طلسم سامانی' طلسم باطل سے عبارت نہیں بلکہ اس حق سے مستنیر ہے جسے اپنے اثر کی بنا پر طلسم کہا گیا تھا۔

......۳......

جمیلؔ بھائی نے مجھے یہ موقع بخشا کہ مجھے ان کی نعت گوئی پر کچھ لکھنے کے بہانے

سرکارؐ کا ذکر کرنے کی سعادت مل جائے۔ میں نے اس مرقع جمیل کی سیر کرتے ہوئے شاعر کے مشورہ سے اسے ایک ترتیب دے دی ہے۔ میں اپنی معروضات اسی ترتیب کے مطابق پیش کروں گا۔

محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انسانیت کو جو نسخہ کیمیا عطا فرمایا ہے اس کا آغاز ''حمدِ رب العالمین'' سے ہوا ہے اور اب یہی آغاز ہر مسلمان کی تحریر کا نشان ٹھہرا۔

اس مجموعہ کا آغاز سات بندوں کے حمدیہ مسدس سے ہوا ہے ۔ مسدس کا دروبست' کئی پہلو رکھتا ہے۔ اگر مسدس سے کتاب کا آغاز ہو تو وہ فاتحۂ کتاب بن جاتا ہے پھر پہلے چار ہم قافیہ مصرے مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کا استعارہ ہیں۔ اور ٹیپ کے دو مصرے اوپر نیچے آسمان وزمین کی علامت ہیں۔ یوں مسدس کا ہر بند شش جہات کی علامت بن جاتا ہے۔

اس حمدیہ مسدس میں لفظوں کی مرصع سازی اور شاعرانہ اہتمام ملتا ہے۔ اس مسدس میں فلسفیانہ اصطلاحات ودلائل کی جلوہ گری بھی اثباتِ ذات خداوندی کے سلسلہ میں نظر آتی ہے۔لیکن اس کا رشتہ حیات وکائنات کے مشاہدے اور مظاہر سے قائم کیا گیا ہے اور یہی قرآنی طرزِ استدلال ہے۔

اعراض عارضی ہیں تو جوہر ہیں بے ثبات
فانی ہر ایک چیز ہے باقی ہے تیری ذات
مرگ وزوالِ خلق خود اس کا ثبوت ہے
جو خالق حیات ہے وہ لایموت ہے

اس مسدس کے بعض مصرعوں میں ندرتِ اظہار کا دامن عجب نظر فروز وعقل افروز نکات کے ساتھ بندھا نظر آتا ہے۔

تو ہے وہ کاف ونون کہ جس سے ہے کائنات

صاحب کن فیکون کو کاف ونون کہنا ندرتِ اظہار ہی نہیں بلکہ اسم کی توقیر بھی ہے۔ ''کن'' جمیل کے اس مصرع میں لفظ نہیں رہتا بلکہ اسم بن جاتا ہے۔ اسے ''حرف'' بھی کہہ لیجئے فارسی میں اللہ حرف بھی ہے اور صاحب حرف بھی۔ یوں ذکرِ خداوندی کس پر معانی انداز میں قرآن کے مخلوق ہونے کی نفی بن گیا۔ اس حمد یہ مسدس میں ہماری شعری روایت، علم اور شاعر کی ذات کا ایسا اجتماع نظر آتا ہے جس پر کوئی بھی رشک کرسکتا ہے۔

دوسری حمد کے لئے جمیلؔ نقوی نے ساقی کی ردیف چنی ہے۔ اقبال نے ساقی کی علامت حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کے لئے استعمال کی ہے کیونکہ ملّت کے مے خانہ کے لئے ساقی مشہود وشاہد کی ضرورت تھی۔ اقبال ہی نے کہیں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین عطا کیا اور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایک ملّت بنایا۔ یعنی ہماری ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل حضورؐ نے فرمائی۔ حمد کے لئے ''ساقی'' کی ردیف کا انتخاب اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جمیلؔ نقوی نے اس ذات کو سچ مچ اپنی شہ رگ سے قریب تر محسوس کیا ہے۔ ساقی سے خطاب اور اس شان سے۔

یہ مہر و ماہ یہ انجم یہ کہکشاں ساقی
اٹھا بھی دے یہ حجاباتِ درمیاں ساقی

ہماری غزل کی روایت رہا ہے۔

برافگن پردہ تامعلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رامی پرستند
کہہ کے کچھ لالہ وگل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

ہجوم لالہ وگل، خندہ برق وشرر بن کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر بن کر

جمیلؔ نقوی نے وحدت الوجودی مضامین کی شوخی کو نازِ بندگی اور نیازِ عبدیت دونوں کا رنگ عطا کرکے اس حمد کی ابتدا کی، پھر ذکرِ محمد عربیؐ حمد میں یوں آیا کہ توحید کا رنگ کچھ اور ابھر آیا۔ حضرت حسانؓ، حضرت کعبؓ بن زہیر اور عہدرسالت کے دوسرے شاعروں کا یہی انداز تھا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے تو بات نعت تک پہنچ جاتی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اللہ کی سب سے بڑی نعمت تھی (اور ہے)۔

ترے جمال سے روشن حریم قلب ونظر
ترا کلام ہے مضرابِ سازِ جاں ساقی
عطا ہو روح کو میری طہارتِ ازلی
بفیضِ رحمتِ محبوبِ دوجہاں ساقی
یہی ہے ایک تمنا یہی ہے ایک دعا
مرے شفیع ہوں سالارِ مرسلاںؐ ساقی

تیسری حمد ایک ایسے سالک کا نعرہ جذب ہے جو کعبہ، صفا، مروا اور گنبد خضریٰ کی دید کے ساتھ ہی رختِ ہوش کو بارِ جسم وجاں سمجھنے لگے۔

پھر چلا ہوں سوئے کعبہ تناہایا ہو

اس حمد کو میں نے ''مقامات'' کا دیباچہ بنا دیا ہے۔

جمیلؔ نقوی کی نعتوں پر نظر ڈالتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آئی کہ ان کی بہت سی نعتیں خطابیہ ہیں۔ شاید حضورؐ سے خطاب کے بارِ عظیم کے پیش نظر عرفیؔ نے نعت گوئی کے بارے میں کہا تھا:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

نعت گوئی اگر شمشیر کی دھار پر سفر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے خطاب 'حرف وبیان کے اس پل صراط سے گزرنا ہے۔ جس کے نتیجے میں آنے والے پل صراط کے سفر کی کیفیت کا تعین ہوگا۔ یہ وہ سفر ہے کہ ہر ایسا استعارہ حقیقت بن جاتا ہے۔

عام طور پر ایک ہی نعت میں وہ' آپ' تم کی ضمائر کے ساتھ حضورؐ کے اسمائے گرامی کا استعمال ملتا ہے۔ خالصتاً خطابیہ نعتیں' سلام اور نظموں کے استثنا کے ساتھ' کم لکھی گئی ہیں۔ جمیلؔ کے ذوقِ حضوری نے اس بارِ امانت یعنی خطاب بہ نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو اٹھالیا ہے اور خدائے محمدؐ نے انہیں اس بار امانت کے اٹھانے کی توفیق اور قوت عطا کردی۔

اس میں دو فارسی نعتوں کے بعد آپ کی نظر سے وہ نعت گزرے گی جو اگرچہ اردو زبان میں لکھی گئی ہے لیکن ہر اس زبان کا بولنے والا اسے سمجھ لے گا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر گرامی کیا گیا ہے (اور ایسی زبان کون سی ہے جس میں نہ کیا گیا ہو؟)

میری جانب بھی ہو اک نگاہ کرم اے شفیع الوریٰ' خاتم الانبیاءؐ

زندگی کے کتنے ہی اداس لمحوں میں اداسی اور بے کیفی پر غلبہ پانے کے لئے اور اپنی زندگی کو معنویت عطا کرنے کے لئے ام حبیبہ کی آواز میں دو نعتیں سنی ہیں۔ ایک تو حضرت جامیؔ کی نعت ''اویس قرنی را'' رسولِ مدنی را'' اور دوسری یہ نعت۔ مگر اب سے پہلے مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ یہ ہمارے جمیلؔ صاحب کی نعت ہے۔ یہ پوری نعت ایسی جنبش لب ہے جس میں روح لفظوں میں ڈھل گئی ہے۔ ہر مصرع دو مساوی کڑوں کی طرح ہے اور یوں محبت کی یہ دنیا تخلیق ہوئی ہے۔ دین اور دنیا۔ یہ بھی تو دو کڑے ہیں۔ آپ کسی بھی انتہا پر پہنچ جائیں ازل سے ابد تک کا سفر کرلیں' دونوں انتہاؤں کا توازن

وجودِ محمد عربیؐ کا صدقہ نظر آئے گا۔ قرآن حضورؐ کی صداقت کا ابدی معجزہ ہے لیکن ذاتِ رسولِ عربیؐ خدا کی بے نشانی کا نشان اوراس کے ہونے کی دلیل ہے۔

آپؐ ہیں وجہ تخلیق کون ومکاں' آپؐ کے دم سے ہیں یہ زمیں وزماں
آپؐ ہیں بے نشانی کا بین نشان' اے شہ دوسرا' خاتم الانبیاءؐ

میں نے اس نعت کو سنتے ہوئے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ام حبیبہ اوراس شاعر کی مغفرت کو اپنے دل میں ایک یقین کی طرح محسوس کیا ہے۔

جمیلؔ نقوی نے اپنے علم' اپنے عشق' اپنے ورثہ ایمان' لفظوں سے اپنے رشتہ...... ان سب کو گوندھ کر نعت گوئی کی ہے۔ ان کی نعت کے خمیر میں ان کی ذات' ان کا ورثہ سب کچھ خوشبو بن کر شامل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے مہر درخشاں کے حضور'اس قطرہ شبنم نے کہ جسے جمیلؔ نقوی کہتے ہیں' اپنے آپ کو یوں رکھ دیا کہ یہ قطرہ اپناوجود کھوبیٹھے کہ یہی عشرتِ قطرہ ہے۔ اپنی ذات کو گم کئے بغیر نعت نہیں کی جاسکتی۔ نعت کے سلسلہ میں جن شعراء کے ہاں تعلّی نظر آتی ہے' اپنے شاعرانہ مرتبہ کا اظہار نظر آتا ہے' وہ میرے نزدیک کچھ ایسا محمود وقت نہیں ہوتا۔ زندگی جاوید اسی ہنگام اور لمحہ سے عبارت ہے جس لمحہ شاعر اور حضورؐ کے درمیان عبد اور آقا کا رشتہ ہو' بلکہ غلامِ غلامانِ محمدؐ کا حلقہ غلامی اپنی گردن میں ڈالنے کو جی چاہے۔ اس مجموعہ کے پہلے ہی حصہ کے یہ چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

ہے جمیلؔ آپؐ کے در کا ادنیٰ گدا
جمیلؔ اک بے سہارا ہے' کرم اس پر بھی ہو شاہاؐ
آقا! جمیل بے نوا' ہے آپؐ کے در کا گدا' صرف آپؐ کا مدحت سرا

دربار مبارک میں حاضر ہے غلام آقاؐ
حاضر ہے درود آقاؐ حاضر ہے سلام آقاؐ

تمہارے در کی گدائی کے سامنے آقاؐ
قلیل و ہیچ ہے دونوں جہاں کی دولت بھی

آپ کے در کا بھکاری ہے جمیلؔ اے آقاؐ
ہو کرم اس پہ بھی کونین کی دولت والے

میں نے پہلے حصہ (خطابیہ نعتوں) کی ہر نعت کے شعر اور مقطعے آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ شاید ہی کوئی ایسا جدید غزل گو ایسا ہو جس نے کسی نہ کسی مقطع میں اپنی شاعری اور شاعرانہ کمال کا ذکر نہ کیا ہو' خواہ یہ کہہ کر سہی کہ یہ عطیہ آقا ہے مگر حضورؐ سرور کائنات' اس غلامِ درِ مصطفیٰ کے ذہن میں اپنی غلامی کے سوا کوئی خیال ہی نہیں آتا۔ اگلی نعتوں میں ایک آدھ جگہ ''شاعری کے بھرم'' کا ذکر آیا ہے یقین ہے کہ اپنے اگلے مجموعے میں ہمارا شاعر' اس منزل سے آگے بڑھ جائے گا۔

اس ذاتِ اقدس کے ہر مدح گو کی طرح جمیلؔ نقوی کو بھی بار بار یہ احساس ہوا ہوگا کہ ان کے ذکر کے لئے کسی لغت میں کوئی لفظ نہیں۔ مگر اس مسئلہ بیان پر اس نقطہ نظر سے بھی تو غور کیا جاسکتا ہے کہ ان کی نسبت ہر لفظ کو معتبر بنا دیتی ہے۔ حضورؐ کا ذکر کرتے ہوئے آدمی سب سے پہلے قرآن اور لغتِ حجازی اور اسلامی اصطلاحات کی طرف متوجہ ہوتا ہے میرے خیال میں اذان اسلام کا منشور ہے۔ اسلام کی تفاصیل کو اگر کم سے کم وقت میں لوگوں کی تفہیم اور اپنے لہو کو گرمانے کے لئے نعرے میں بدلا جائے تو وہی ہماری اذان ہے۔ ''اللہ اکبر'' اللہ کی وحدت اور محمدؐ کی رسالت کی گواہی' صلوٰۃ وفلاح کی طرف

دعوت'' اذان کے انہیں پہلوؤں کے پیشِ نظر اقبال نے سرکار صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بارے میں کہا۔

تو صلوٰۃِ صبح 'تو بانگ اذان

جمیل کا یہ شعر سنئے۔

زمیں سے عرش تک جو گونجتی ہے وہ اذاں تم ہو
مشیت کی زباں' قرآن کا حسن بیاں تم ہو

''اے رحمتہ للعالمینؐ'' بھی ایسی ہی نعت ہے جس میں خاتم الانبیاء کی سی آرائش درو بست اور اہتمام ملتا ہے۔ یہاں ایوانِ ذکرِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتنے ہی طاقوں میں جمیلؔ نقوی نے حرف وزبان کے چراغ روشن کئے ہیں یہ ایوان بھی عجب طلسمات ہے کہ ہر آن' ہر نعت کے ساتھ اس میں طاق اور چراغ بڑھتے جاتے ہیں۔

جی تو یہی چاہتا ہے کہ قلم محمد اور محمد کی چاہت والوں کا ذکر یوں ہی کرتا رہے لیکن یہ مجموعہ نعت تیار ہے اور میں اس کے اور آپ کے درمیان حجاب نہیں بننا چاہتا۔ اب میں مختصراً اس مجموعے کے دوسرے حصوں کے بارے میں کچھ عرض کرکے آپ سے رخصت لوں گا۔

مجموعہ کے دوسرے حصے ''ایوان نعت'' کے موضوعات' آہنگ اور لہجے میں نعت گوئی کے طریقہ راسخہ کو اپنایا گیا ہے۔

اس حصہ کی پہلی نعت میں حضورؐ کے اسمائے گرامی بھی ہیں۔ ''اکملت لکم دینکم'' کی تفسیر بھی ہے ۔ انفس وآفاق میں ذاتِ نبیؐ امی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت بھی ہے اور ان شہادتوں اور مراتب کی گواہی کے بعد بات حضور سے اپنے ذاتی رشتہ پر آکر ختم ہوئی ہے۔

وہ کہ ہر درد کا درماں ہیں جمیلؔ
اپنے ہر زخم کا مرہم لکھوں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سچے اور آخری نبیؐ ہونے کی اس سے قوی ترشہادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ پندرہویں صدی ہجری کی آمد آمد ہے اور نوے کروڑ مسلمانوں میں سے ہر مسلمان انہیں اپنے ہر زخم کا مرہم جانتا ہے۔ یہ اندازِ فکر ونظر اور یہ رشتہ وقت کے آخری لمحے تک حضورؐ اور امتِ مسلمہ کے درمیان قائم رہے گا۔

میں نے شمائل اور زلف و رخ کی بات چھیڑی تھی۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہ تھی کہ یہ عاشقانہ لے مرتبہ رسالت کے ذکر پر غالب آجائے مگر آدمی یہ تو سوچتا ہی ہے کہ وہ رخسار کیسے ہوں گے؟ پھر ''سراپا'' کا نہایت مہذب اور بلند معیار محسن کاکورویؒ قائم کرچکے ہیں۔ یہاں تفصیل نہیں بلکہ اجمال ہے اور اجمال ایسا کہ اس میں کائنات سمٹ آئے۔ ایسے چند مقامات ملاحظہ ہوں۔

عکس رخِ محبوب سے روشن ہیں شب وروز
صحن حرم وکوچہ وبازارِ مدینہ
کعبہ کی بنیاد جس محراب پر رکھی گئی
اس مبارک ابروئے خمدار کی باتیں کریں
جس کے پرتوسے درخشاں ہیں مہ ومہرونجوم
اس جمالِ مرکز انوار کی باتیں کریں
آپ کے حسن جہاں تاب کو جو دیکھ سکے
میرے آقاؐ! مجھے وہ دیدہ بینا مل جائے

طریقۂ راسخہ کی ان نعتوں میں بعض روایتی مضامین کے نئے پہلو ابھر کر سامنے آئے ہیں۔مثلاً حسن کی جگہ محاسن کے استعمال سے ذات وصفات دونوں کا احاطہ ہوجاتا

ہے:

آپ کے اور محاسن بھی ہیں بے حد و شمار
حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰؑ یدبیضا کے سوا

''آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری'' کہنے والے نے بھی حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ اور یدبیضا کو مثال کے طور پر پیش کیا تھااور ان اجزا سے دوسرے ان کے ''محاسن'' کی طرف اشارہ کیا تھا ''خوباں'' کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے مگر جمیلؔ نقوی نے ''کے سوا'' کے ٹکڑے سے مضمون کو چمکادیا ہے۔

اسی طرح بیسویں صدی کے ایک ذی شعور انسان کی حیثیت سے انہیں دنیا کی ترتیب اور شیرازہ بندی میں پیغامِ محمدیؐ کی اہمیت کا پورا پورا احساس وادراک ہے۔ یہ روایت ایک مستقل رجحان کی حیثیت سے حالؔی سے شروع ہوتی ہے۔جمیلؔ نقوی کے ہاں عالمِ انسانیت پر حضورؐ کے احسانات کا ذکر محض ''اوپری'' نہیں بلکہ یہ احساس وشعور بھی ان کے ہاں جذبہ بن جاتا ہے۔

محمدؐ محسنِ انسانیت ہیں
لقب زیبا ہے ان کو سیّدی کا
آپؐ آئے تو قرآن کی شکل میں
زیست کا اک مکمل نظام آگیا
جن کی ندرت نے بدل ڈالا زمانے کا مزاج
آؤ ان عہد آفریں اقدار کی باتیں کریں
شریعت اس کی بنیادِ دساتیر امم ٹھہری
یہ وہ قانونِ ناطق ہے کہ عالم گیر ہے لوگو
مدینہ جب سے محبوب خدا کا مستقر ٹھہرا

دبستانِ عمل، گہوارہ علم و ہنر ٹھہرا

اس حصہ کی نعتوں میں بھی وہ رمزیت اور موضوعی انداز ہے جو غزل کی ایک پہچان ہے لیکن جمیلؔ صاحب کے ہاں مجھے کئی ایسی نعتیں نظر آئیں جو مشہور اور معروف غزلوں کی ہم طرح ہیں۔ یوں عشقِ محمدیؐ نے نوائے غزل کو نوائے سینہ تاب بنادیا ہے۔ اس حصہ کو لہجے کی نسبت سے میں نے ''غمِ معتبر'' کا نام دیا ہے، اعتبار اسی کو ہے جس کو ان سے کچھ نسبت ہو، خواہ وہ فرد ہو یا جذبہ یا قوم۔

اے رہنمائے راہِ حقیقت ترے نثار
پہچاننے لگا ہوں غمِ معتبر کو میں

اسی غزل میں ایک شعر ہے۔

جس کی نظر نے پھول کھلائے چمن چمن
نکلا ہوں ڈھونڈنے کو اسی خوش نظر کو میں

اس شعر نے مجھے ایوانِ نعت کے اس طاق تک پہنچا دیا جہاں یہ دو چراغ روشن ہیں۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیؐ ست

کائنات کی ہر بہار سامانی نورِ مصطفیؐ کا پرتوِ جمیل ہے اور بہار سامانی کے ہر امکان کے پیچھے اسی نام کا عکس ہے۔

کسی تبصرے کے بغیر اس حصے کے چند شعر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

سکونِ دل لئے ہوئے قرار جاں لئے ہوئے
وہ آئے ساتھ رحمتوں کا کارواں لئے ہوئے

اک پردہ انوار تھا نظروں کے مقابل
کچھ بھی نہیں اس نظرِ روشن کے سوا یاد

زندگی جس میں نہ شامل ہو مدینہ کا سفر
زندگی کا ہے کو ہے، بادیہ پیمائی ہے

آسماں خم ہے ازل ہی سے اسی کوشش میں
کہ جبیں آپؐ کے نقشِ کفِ پا تک پہنچے

ایک بہتا ہوا دریا ہے، عنایت ان کی
سب پہ ہوتی ہے باندازِ دگر ہوتی ہے

اگلے حصے کی نسبت سے میں نے ''غمِ معتبر'' کے پانچ شعروں کا انتخاب کیا۔ یہ پانچ کا عدد حضورؐ کے ساتھ ''علی و فاطمہ، شبیر و شبر'' کے رشتے کا اشارہ ہے۔ غمِ معتبر کے بعد چار چار مصرعے ہیں، قصہ یہ ہے کہ:

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

اسی لئے انہیں رباعی کہہ کر کیوں ادبی نزاع کو جنم دوں۔ ویسے اقبال نے رباعی کے وزن کی قید کو توڑ کر رباعیاں کہی ہیں اور اقبال عروض پر نظر رکھتے تھے۔ یہ کم نظری نہیں اجتہاد ہے۔ ویسے یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کا یہ اجتہاد مستقبل کی رباعی کی نقش گری کررہا ہے جس طرح مثنوی نے مخصوص بحروں کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا ہے اسی طرح اقبال نے رباعی کو نئی آزادیوں سے ہم کنار کیا۔

ان چار مصرعوں کو میں نے جانشینانِ مصطفیؐ کی علامت جانا۔ یہ علامت اور اشارہ مجھے جمیل نقوی ہی کی ایک نعت سے عطا ہوا:

برگزیدہ جانشینانِ رسولؐ ہاشمی
آیئے ان برگزیدہ چارؓ کی باتیں کریں

باقی اشعار اسی نعت میں ملاحظہ ہوں۔ جمیلؔ نقوی کی اسی عقیدت کے پیشِ نظر میں نے ان چار چار مصرعوں کو ''ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ'' کے توسط سے بارگاہِ رسالتؐ میں جمیل نقوی کا نذرانہ قرار دیا ہے۔ چار مصرعوں میں اختصار و ایجاز کا وہ عالم ہے جیسے زبان کی طنابیں کھینچ لی گئی ہوں۔

میں اپنی مختصر نویسی پر نازاں تھا۔ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہنے کی کوشش میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ لیکن آج تو اپنی بات اور اس مجموعے کے ذکر (جائزہ نہیں) کو سمیٹنا کتنا مشکل ہوگیا ہے۔ اگلے حصے کو ''احوالِ فقیر'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس میں اس زمین وزماں کی ایک جھلک ہے جس میں بطفیلِ عشقِ نبیؐ جمیل نقوی مقیم ہیں۔

طنابیں کھنچ گئی تھیں فاصلوں کی عرش وبطحا کے
کہ احمدؐ اور احد ہم راز تھے کل شب جہاں میں تھا

یہ خسروؔ کی آواز کی بازگشت ہے

محمدؐ شمعِ محفل بود، شب جائے کہ من بودم

یہ آوازِ بازگشت نہیں بلکہ وہی آوازِ مسلسل ہے جس کا ایک اور پردہ جمیلؔ نقوی کے الفاظ میں وا ہوا ہے۔ یہ آواز کی پنکھڑیوں کا رقص ہے۔ یہ محفل رقص سیارگاں ہے اور یہ رقص کسی کی معراج کے جشن کا رقص ہے۔ اس میں کسی کا ہونا اور اپنے ہونے کی گواہی دینا۔ لفظ وبیان کی معراج ہے۔

یہاں میں نے ترتیب دانستہ بدل دی ہے۔ مکانی ترتیب کے اعتبار سے ''مقامات'' کا حصہ پہلے آنا چاہیے تھا کیونکہ انہیں مقامات سے نسبت نے جمیلؔ نقوی کے احوال کی تخلیق کی ہے۔ ترتیب کا یہ تبدّل وقت میں الٹا سفر ہے۔ اس میں وہ حمد ہے جس

کا رشتہ صفاومروہ، گنبدِ خضرا، گلشنِ طیبہ اور دربارِ مدینہ سے ہے پھر کعبہ کی پہلی دید کے شگوفے کی چٹک ہے، مدینہ کی طرف غلامانِ خیرالانام کے سفر کی داستان ہے۔ مدینہ کی خدا آشنا گلیوں سے سرگوشی ہے اور یہ سفر ''طواف الوداع'' پر ختم ہوتا ہے۔

یہ مجموعہ سرورِ کائنات، رحمتِ دوعالم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ''سلام'' پر ختم ہوتا ہے۔ سلام ان پر جو ہمارے آقا ہیں، سلام ان گلیوں پر جو آج بھی ان کے نقشِ کفِ پا کے سورج اپنے ذروں میں چھپائے ہیں اور سلام اس دنیا پر کہ ان سے پہلے تیرہ خاکدان تھی اور جب وہ آئے تو عالم امکان بن گئی اور سلام غلامانِ مصطفیٰ پر اور سلام جمیلؔ نقوی پر کہ اس نے اپنے وجود میں ان خوشبوؤں کو سمیٹنے اور آنکھوں میں ان کے جلوؤں کو بسانے اور دل کی دھڑکنوں کو ان کا نام بنانے کی کوشش کی ہے۔

(ارمغان جمیل/جمیل نقوی، ۱۹۸۴ء، ایسٹ پبلشرز، کراچی)

فیضانِ رسولؐ

گزشتہ سال ایک صبح ٹیلی فون پر ایک آواز ابھری ...... ''کشفی صاحب ہیں ؟''

آشنا آشنا سی آواز' جو حافظے کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔

''میں بول رہا ہوں۔''

''مسلم عرض کررہا ہے۔''

اور اس چھوٹے سے جملے نے وقت کی بساط کو سمیٹ لیا۔تیس بتیس سال پہلے کی باتیں ایک لمحے میں تازہ ہوگئیں۔کراچی کی ادبی فضاؤں میں اس شخص کی آواز قابلِ اعتنا سمجھی جاتی تھی۔ افسانے' نظمیں' غزلیں اور گیت لکھنے والا یہ جوانِ رعنا ادبی کتابیں بھی بڑے سلیقے سے شائع کررہا تھا۔''خدا کی بستی'' بھی اسی نے چھاپی تھی۔ اردو اکیڈمی سندھ کے علاوہ ''مکتبہ نیا راہی'' وہ ادارہ تھا جس نے نشرواشاعت کی دنیا میں کراچی کو ایک اہم ادبی مرکز بنا دیا تھا۔ اور ماہ نامہ ''نیاراہی'' میں ادب کے ساتھ ساتھ معاشرتی مسائل کو پیش کرکے اس شخص نے اپنی درد مند طبیعت کا اظہار کیا تھا۔

اور پھر ٹیلی فون پر ملاقات کا وقت ٹھہرااور ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے مل گئے۔ اس بار مسلمؔ صاحب کی بنیادی شخصیت کے بعض دبے ہوئے پہلوؤں کا اظہار نمایاں طور پر دیکھا۔تبسم میں دل نوازی کے ساتھ قناعت کی جھلک' چہرے پر ٹھہراؤ اور ذات میں آہِ صبح گاہی اور گریۂ نیم شبی کا نم۔

جب وہ پہلی بار ملنے آئے توان کے ہاتھوں میں ''حمدونعت'' کا مسودہ تھااور اس

بار راغبؔ صاحب بھی شریکِ بزمِ دوستی تھے۔ میرے اور راغبؔ صاحب کے درمیان ان کی نعتیہ شاعری' تعلق کا سب سے قوی ذریعہ رہی ہے۔ شارجہ میں مسلمؔ صاحب سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو اس فقیر کا ذکر بھی درمیان میں آ گیا۔

رب جلیل نے راقم الحروف کو جس جس طرح سے نوازا ہے اس کے ذکر کے لئے سفینہ درکار ہے۔اوراس کا جو بندہ بھی اپنے احوال پر نظر ڈالے گا یہی کہہ اٹھے گا' مگر اس کے احسانات میں سے دواحسانات بہت بڑے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے بندوں سے بے نیاز کردیا۔ دوسرے یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر میں اپنی تلاش کرنے والے شاعروں اور ادیبوں کے دلوں کو اس نے اس ناچیز کے لئے کھول دیا۔ جتنے نعتیہ مجموعوں پر مقدمے اور دیباچے لکھنے کی سعادت مجھے عطا کی گئی اس پر نازاں ہوں کہ یہ ذکرِ ختم المرسلینؐ کا ایک وسیلہ ہے۔

''حمدونعت'' کا مسودہ میرے پاس کئی مہینے سے ہے۔ اس عرصے میں مسلمؔ صاحب کئی بار کراچی آئے اور ہر دفعہ ملاقاتیں رہیں لیکن پہلی ملاقات کے بعد بیتے ہوئے دنوں کے ذکر کی طرف طبیعت راغب ہی نہ ہوئی۔ میں جب بھی ملتا' یہی دل چاہتا کہ ان کی روحانی واردات کو سمجھوں اور انہیں اپنے قلبی واردات کے بیان پر اکساتا رہا......ویسے تو ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری اس واردات کا اظہار ہے جو قلب ونظر کی دنیا سے علاقہ رکھتی ہے۔ان کی منظومات پر تاریخ ومقام دونوں کااندراج ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کا ہر قاری میری طرح ان کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو خانہ کعبہ کے طواف اور گنبدِ خضرا کی دید میں مصروف پائے گا...... بیت اللہ اور حرم شریف صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے :

جہاں تمام سوادِ حرم ہوا اس کو

اسی لئے مسلم صاحب شارجہ میں ہوں یا آسٹریا میں ہوں یا ترکی میں' اپنے مرکز

وجود کے گرد ہی مصروفِ سفر اور مصروفِ پرواز رہتے ہیں۔

اس مجموعہ کے ساتھ جناب ابوالامتیاز ع س مسلم کی دو نثری تحریریں بھی شامل ہیں جو ان کی شاعری اور شخصیت کو سمجھنے میں پڑھنے والوں کی رہنمائی کریں گی، ویسے جس وقت میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ''اوس اور کرنیں'' کا مصنف حمد و نعت تک کیسے پہنچا تو ان کے شخصی پس منظر کی تصویر ذہن میں دھندلا گئی تھی، اور اسی طرح ''اوس اور کرنیں'' بھی سامنے نہ تھی۔ عبدالستار جالندھری کا تخلص یا قلمی نام مسلم ہی اپنے مرکز سے ان کی وابستگی کا اعلان ہے۔ اس کے علاوہ وہ چنگاری جو ان کے وجود میں موجود تھی وہ حمد و نعت میں شعلۂ رخشاں بن گئی ہے۔

نگہبانی تجھے انسانیت کی دی گئی مسلم
ہے مرگِ ناگہاں، کارِ نگہبانی سے کوتاہی
طلسمِ احمریں کو توڑ ڈالو قوتِ حق سے
بڑھو بنیاد استبداد ڈھادو اب تو جاگ اٹھو
تمہارا جذبِ ایمانی ہے اک سیلِ رواں گویا
کچھ اس سیل رواں کو آزمالو اب تو جاگ اٹھو

ملّت کے افرد اور اسلام سے یہ محبت اللہ اور اس کے رسولؐ سے وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلم صاحب کی شاعری کے مستند اور مروجہ اسالیب کے ساتھ ساتھ جو ہندی آہنگ ہے وہ ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ پنجابی اور پوربی گیت ان کے لئے حُدی کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے جالندھر اور بنارس میں زندگی کا ابتدائی حصہ گزارا اور ملّی تحریکات نے اردو کو ان کی میراث بنادیا۔ یوں ان کے ہاں لسانی تنوع موجود تھا۔ ادھر مطالعہ اور قرآنِ حکیم سے قربت نے ایک علمی وقار عطا کردیا ہے جس کی شہادت ان کا یہ مجموعہ نعت وحمد ہے۔ اللہ کے اسماء الحسنیٰ، قرآن حکیم کے حوالے اور عربی

کے ٹکڑے ان کے ہاں نہایت بے ساختگی سے آتے ہیں۔ اس کا ایک سبب قیامِ شارجہ بھی ہے۔

الحمدللہ اب انہوں نے اس لسانی وسعت وتنوع، اپنے جذبے، اپنے علم اور اپنی ذات کی سالمیت کے ساتھ اللہ کے ذکر اور حضورؐ کے مرتبہ کی زمزمہ سنجی کو اپنی متاع بنالیا ہے۔ اس مجموعہ کے قاری کو یہ رنگارنگی محرابِ قوس قزح کی صورت نظر آئے گی۔ ان کے ہاں عربیت، فارسیت اور ہندیت کے رنگ فطری ہیں اور ان کے ذوقِ عبودیت وعشقِ رسولؐ کے مختلف نشانات کی طرح ہیں۔ یہ حمد یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

الٰہی نہیں کوئی تجھ سا شفیق
ہے لاریب تو رب بیتِ عتیق (عربیت)
مِری کِشتِ پندارِ گستاخ میں
الٰہی اگا بندگی کا مذاق (فارسیت)
بجلی، بادل، برکھا، طوفاں، سب تیری آیات
برج، ستارے، سیارے اور کیا آکاش کی چال (ہندیت)

اسالیب کے ان سارے رنگوں میں ذکرِ خدا اور حبِ رسولؐ نے عجب وحدت پیدا کردی ہے۔ سارے رنگ ٹوٹ کر، بکھر کر، ایک نئے رنگ کو جنم دیتے ہیں۔ وہ رنگ جس میں صبحِ ازل کی اولیت اور شامِ ابد کی جاودانیت کے سائے ہیں۔ مسلم کہیں ہندی بھگتی روپ کو نیا اسلامی روپ دیتے ہیں جو ممکن ہے کہ صیغۂ تانیث کی وجہ سے بعض ثقہ طبیعتوں کو پسند نہ آئے:

آؤ سکھیو! پریم کہانی کانوں کان سناؤں

اور کہیں وہ نظیر اکبرآبادی کی روایت کو ایک نئی فضا عطا کرتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں اور پیشوں سے اصطلاحیں لے کر وہ انہیں نیا شعری آہنگ دے

دیتے ہیں۔ یہ مثال ملاحظہ ہو:

شک کی اینٹیں، وہم کا گارا، پاپوں کی دیوار
بے وسواسی کی چھت سر پر حرص کے ہیں شہتیر

فنِ تعمیر اور حیاتِ انسانی کی مطابقت کی گواہی تو مخبرصادق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، جب مسلمانوں کو ایک عمارت یا دیوار قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایک اینٹ اپنی جگہ سے سرک جائے تو ساری عمارت ڈھے پڑے۔ اس شعر میں ہماری آج کی زندگی کی سچی تصویر کیسی تازہ کاری کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں کئی ایسے مقامات ہیں کہ ع س مسلم کا اسلوب حددرجہ انفرادی ہوگیا ہے اور ان کے شاعرانہ آہنگ پر کسی دوسرے کی چھاپ پڑتی نظرنہیں آتی۔ یہ مصرعہ دیکھئے :

محمدؐ کہ براق جس کا خرام

قرآن حکیم کے اشاروں اور اصطلاحوں نے مسلم کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کو معنوی طور پر گہرائی اور گیرائی بخشی ہے۔ سورۃ الفتح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوںؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ ''یہ کافروں پر شدید ہیں اور آپس میں رحیم ہیں۔''...... دیکھئے ایک ہی حمدیہ غزل میں **رحماء بینھم** کا اظہار کس کس طرح ہوا ہے:

دوستوں کی انجمن میں موجہ بادِ صبا
بزمِ یاراں میں ہوں یوں جیسے خرامِ بوئے گل
اہلِ ایماں کی جلو میں، پردہ گل کی طرح

حمد کے اشعار مسلسل مناجاتوں اور دعاؤں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بار بار ایک زندہ حوالے کے طور پر آیا ہے، کیونکہ ہر ذی شعور صاحبِ ایمان کی طرح ع س مسلم کے لئے بھی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عبد ومعبود کے درمیان سب سے قوی، سب سے مضبوط اور مستند حوالہ ہیں۔ ان کی ذات اثباتِ رب کی محکم ترین دلیل

کل بھی تھی اور آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی ......وہ کل جس کا دامن ......دامن قیامت سے بندھا ہوا ہے۔

ان دنوں ہماری شاعری میں نعت سکہ رائج الوقت ہے اور بہت سے شعراء اس صنف کی مقبولیت کی وجہ سے اور ریڈیو ٹیلی ویژن پر آنے کے لئے نعتیں کہہ رہے ہیں مگر یہ نعتیں مشقِ سخن کا نتیجہ ہیں یا زیادہ سے زیادہ ان میں دماغ اور فکر کا عنصر ہے۔ اب ع س مسلم اس مجموعے کو لے کر بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے ہیں(ہم آپ تو ضمناً ان کے قاری بن گئے ہیں) اور یوں احمد ندیم قاسمی، عبدالعزیز خالد، اقبال عظیم، راغب مراد آبادی، حافظ لدھیانوی، مظفر وارثی، صہبا اختر، حفیظ تائب، اعجاز رحمانی، منیر قصوری، طفیل ہوشیارپوری اور مسرور کیفی وغیرہ جیسے شاعروں کے قبیلے میں ایک اور شاعر کا اضافہ ہوگیا ہے یہ قبیلہ عشاق ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نعرہ ہے :

کسے کہ کشتہ نشد ازقبیلہ ءِ مانیست

ع س مسلم کی ان نعتوں کو پڑھئے، ان کی داد کے لئے جدید ''لفظیات'' کی دنیا میں آپ کو مناسب لفظ نہیں ملیں گے۔ کیونکہ یہ کیف ومستی اور جذب وشوق کی شاعری ہے، مگر یہ کہتا چلوں کہ اس میں شاعر کا ذہن بھی پوری طرح شریک ہے۔ اسلام تو پوری شخصیت کے ساتھ اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اپنے دائرے میں داخل ہونے کا مطالبہ کرتا ہے۔

یاایھاالذین امنو ادخلو افی السلم کافة

مسلم صاحب کی نعتیں پڑھتا ہوں اور اقبال کے لفظوں میں ان کو داد دیتا ہوں۔

بنگر کہ جوئے نورچہ مستانہ می رود

اپنی روانی اور سرمستانہ سفر میں یہ جوئے نور ہندی، عربی اور فارسی الفاظ کو اجالتی اور موتیوں کی طرح نکھارتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس جوئے نور کا وفور دیدنی ہے اور

شاید یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں شریعت کے ضابطوں پر محبت کا وفور غالب آ گیا ہے۔

مسلم کا یہ مجموعہ ان کے نفسِ مطمئنہ کا آئینہ ہے۔ اور اس نفسِ مطمئنہ کے اطمینان کی اساس، قول وحیات وآثارِ ختم المرسلینؐ پر اعتبار واعتماد ہے کہ یہی دین ہے :

تجھ سے نفسِ مطمئنہ کی جلا
تونے جو کچھ کہہ دیا وہ معتبر

مسلم صاحب نے اپنے نثری کوائف میں مولانا ظفر علی خان اور ان کی نیلی پوشاک تحریک کا بھی ذکر کیا ہے۔ مجھے ان کا نعتیہ اور حمدیہ کلام پڑھتے ہوئے بھی ظفر علی خان یاد آئے۔ دونوں ہی شاہِ طیبہ وبطحا کی دنیا میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی ان دونوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے مشکل اور سنگلاخ قوافی کو رام کرنا۔ظاہر ہے کہ مسلم ظفر علی خان جیسی قدرتِ کلام نہیں رکھتے لیکن عشقِ تاجدارِ دوعالم ان پر قوافی کو سہل بنا کر ان قوافی کو گوہرہائے مدحِ سرکار کا صدف بنا دیتا ہے۔

مسلم کی نعت گوئی پر فیضانِ رسولؐ کی روشنی یوں نظر آتی ہے کہ ''صحرا کا پھول'' کی ردیف جیسے تختہ گل بن گئی ہے۔

روضۃ الجنت میں تاباں ہے وہ اک صحرا کا پھول
سینکڑوں گلشن بداماں ہے وہ اک صحرا کا پھول

اور یہ کیفیت عاشقانہ زبان کو بھی خاطر میں نہیں لاتی، بلکہ زبان کا آبگینہ تندیِ صہبائے عشق سے پگھل جاتا ہے۔

آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

اس عالمِ کیف میں ''یومِ استفتاح' رباّح ' اِستِصباح'' جیسے الفاظ اور تراکیب بھی بعض نعتوں میں نظر آتی ہیں جو ہماری زبان کے لئے غریب ہیں۔میں قرآن شریف کے اشارات کو غرابت کے اس دائرے میں ہرگز شامل نہیں کرسکتا کہ ان سے آگاہی ہم پر

لازم ہے۔ مثلاً ''فالق الاصباح'' کی ترکیب قرآنی سند اپنے دامن میں رکھتی ہے ......اور حضورؐ کی نعت کا سب سے حسین پیرایہ یہی ترکیبیں، اشارے اور کنائے ہوسکتے ہیں۔

اسم ''محمدؐ'' سرمایہ عشاق ہے اور مسلم صاحب کے اس مجموعے میں محمدؐ کی ردیف میں کئی نعتیں یک جا موجود ہیں۔ یہ اتفاق نہیں بلکہ شاعر کے اس ایمان کا اظہار ہے جسے اس لفظ کی تکرار سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور ان میں سے کئی نعتیں تو ہم قافیہ بھی ہیں۔

مسلم صاحب کی ہندی نعتوں میں عربی الفاظ کے استعمالِ مسلسل سے ہماری شاعری کا ایک نیا لسانی مزاج ابھرا ہے یہ نغمہ ہندی ہے مگر اس کی لے حجازی ہے اور یوں رسولِ رب المشرقین ومغربینؐ کی مدح لفظوں کو ایک نیا جغرافیہ عطا کردیتی ہے۔

مجموعے کے آخر میں جو سلام ہیں ان میں الفاظ کے سَبُوُ آسمانِ نعت کی طرف یوں اچھالے گئے ہیں کہ عاشقِ رسولؐ اصغر گونڈوی کے الفاظ میں ثریا کہیں انہیں۔ یہ نعتیں نہیں بلکہ ''شرارِ معنوی'' گردش میں ہیں یارو۔

اب آپ مجھے اجازت دیں اور اس مجموعے کا مطالعہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ نعتیں اور یہ مناجاتیں آپ کے لئے سفرنامہ بن جائیں گی۔ آپ کہیں مسلم صاحب کی معیت میں اپنے آپ کو بیتِ عتیق میں پائیں گے تو کبھی روضہ الجنتہ میں خاموشیوں کے لہجے میں مصروفِ ثنا خوانی...... خداوندا! تو اس مجموعے کو قبول فرما اور دربارِ رسالتؐ سے بھی اسے شرفِ قبول عطا ہو کہ یہی صلہ وشاعر ہے اور بس۔

(حمد ونعت/ ابوالامتیاز ع۔س مسلم، ۱۹۸۴ء)

اسوۂ احمد مختار اور حافظ کی نعت گوئی

ہمارا دور نعت گوئی کا دور ہے۔ وقت کی گردش نے انسان کو بارگاہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادیا ہے۔ اقبال نے آج کے انسان کے مسئلہ کو یوں بیان کیا ہے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

ثبات کا مکمل ترین بشری نمونہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی ہے جن کا ہر پہلو اللہ کے رنگ کی شہادت ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ اور کون سا ہوگا؟ اللہ کے یہ رنگ صفاتِ الٰہیہ ہیں اور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود فرقان حمید نے مسلمانوں کے لئے رؤف و رحیم کہا ہے۔ یہی ذات جو فنا کے دشت میں روضۂ بقا کی طرح تھی وہ دستور حیات لے کر آئی جو قرآن حکیم اور اس کی سنت سے عبارت ہے۔

جناب حافظ عبدالغفار حافظ کے منتخب نعتیہ اشعار پر نظر ڈالتے ہوئے یہی احساس میرے قلب وفکر میں ابھرا کہ وہ مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے رمز شناس اور فریضۂ نبوت کے نکتہ داں ہیں۔ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت میں نمایاں ترین حیثیت رکھتے ہیں اور آج خود سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تزکیۂ نفس کا وسیلہ ہے۔ جناب حافظ یہ نکتہ شاعری کی زباں میں بڑے سلیقے سے بار بار پیش کرتے ہیں۔

اسوۂ احمد مختار پر چلئے ورنہ

ٹوٹ کر شیشہ کردار بکھر جائے گا
ٹوٹ جائے گا طلسم گردش ایام بھی
احمد مختار کی سیرت پہ چل کر دیکھنا

دوسرے شعر میں تو جیسے حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کا پورا عہد اور اسلامی تاریخ کا ہرزریں دور سمٹ آیا ہے۔ اقبال نے بھی یہی نکتہ دوسرے انداز سے بیان کیا ہے

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں اور ان کی آنکھوں کے دیکھنے والوں کے قدموں تلے مسافتیں سمٹ گئی تھیں اور وقت کے پیمانے بدل گئے تھے۔ اس زمانے کی معلوم دنیا کا بہت بڑا حصہ تیس سال کے اندر اندر اسلام کے زیر اثر آچکا تھا۔ احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا اتباع کرنے والوں کے سامنے ایران کے وقار وعظمت نے سر جھکادیا تھا اور رومتہ الکبریٰ کی قوت سجدہ ریز ہوگئی تھی۔

جناب عبدالغفار حافظ کی نعتوں کے کتنے ہی موضوعات ہیں۔ وہ حرفِ کن فکاں کا راز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو سمجھتے ہیں۔ عبدِ کریم وعظیم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے رب کی قربت کو بھی جانتے ہیں۔ ان کی شفاعت کے امیدوار بھی ہیں لیکن ان کی نعت گوئی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ کریمانہ پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے اور بجا طور پر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سرکارمدینہ، آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قرآن عظیم میں یہ بات اہل ایمان سے کہلوائی ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی

جب اللہ کی محبت اور گناہوں کی مغفرت کا راستہ اتباع محمد عربی الصلوٰۃ والسلام ہے تو اس سے زیادہ اہمیت اور کس بات کی ہوسکتی ہے۔ جناب حافظ نے اپنی نعت گوئی میں

اسی قرآنی حکمت کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔

کوئی کہیں سے چھیڑے افسانہ زندگی کا
ہے اسوۂ محمد پیمانہ زندگی کا

اسوۂ حسنہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ جناب حافظ کی فکرو حافظہ کے طاق میں وہ چراغ بھی روشن ہے جس کا پہلا شعلہ غار حرا میں چمکا تھا اور تاریک دنیا کو روشن کر گیا تھا اور جس کی روشنی کے حلقے اور دائرے **اذاجاء نصرالله** اور **الیوم اکملت لکم دینکم** تک بڑھے اور پھیلتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے تیئیس برسوں کے ان ربانی پیغامات نے اس کائنات کے آخری دن اور قیامت کے بپا ہونے کے ہنگام تک کے لئے انسانی ہدایت اور آئین ربانی کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ عبدالغفار صاحب کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اس پیغام سے منور فرمایا ہے اور ان کے کلام کو بھی۔

حضور نے سرِ فاراں جسے جلایا تھا
وہ شمع آج بھی روشن ہے آب وتاب کے ساتھ

نعت گوئی جناب عبدالغفار حافظ کا محض ایک مشغلہ نہیں بلکہ یہ ان کا مقصد حیات بن گیا ہے اور ان کی اس لگن اور ذوق نے ان پر نہایت مشکل زمینوں اور ردیفوں کو سہل کردیا ہے۔ زمین غالب میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔

نامِ خدا یہ مرتبۂ عظمتِ شہ کے باب میں
اپنے کلام پاک میں کہتا ہے خود خدا کہ یوں

اور اب تو ان کے ذوق نعت گوئی کا وہ مرحلہ اور منزل ہے کہ

نعت اس پرشہ کونین کی لکھ دے حافظ
ہاتھ میں آئے ترے جب کوئی سادہ کاغذ

کاغذ کی ردیف، صرف حضور کی محبت سے یوں ایک روشن راستہ بن گئی ہے۔

جناب عبدالغفار حافظ کے لئے یہی دعا ہے کہ

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے!

(ارمغانِ حافظ/حافظ عبدالغفار حافظ، ۱۹۸۵ء، اقلیم نعت، کراچی)

تلاشِ جلوۂ حرفِ سپاس

نعت صرف ایک صنفِ سخن نہیں۔ یہ اظہار وسکوت کا سنگم ہے۔ جب بے زبانی' زبان بن جائے تو نعت کا کوئی شعر نازل ہوتا ہے۔ نعت' ذاتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شاعر کے سارے وجود کے تعلق کے اظہار کا نام ہے۔ سارا وجودؔ میں نے یوں کہا کہ آدمی اپنی فردیت (اور انفرادیت) کے ساتھ ساتھ اپنی ذات میں انجمن اور غالب کے لفظوں میں محشرِ خیال بھی ہے۔ ایک امتی کے رشتے سے اس ذاتؐ کے سامنے اپنے آپ کو گم کر دینا ہماری معراج ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ انسانی تاریخ کے مبصر اور ادراک وآگہی کے دبستانوں کے مشاہد اور طالبِ علم کی حیثیت سے ان علوم وحقائق کا شعور رکھنا جو اس امی لقبؐ کی گفتار اور عمل سے وجود میں آئے اور یوں کہ حیاتِ انسانی کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بدل گیا اور صراطِ مستقیم ابھر کر روزِ موعود تک کے لئے قائم ہوگئی......اپنے آپ کو گم کردینے اور صراطِ مستقیم اور انسانیت کے مستقبل کو پالینے کی سکت جب شعر کے قالب میں ڈھلتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر کے لئے مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں بلکہ شہود ہے۔

تابش دہلوی صاحب کی نعتوں کے مطالعے نے مجھے یہی احساس دیا ہے اور میں سوچتا رہا کہ تابش کے کلام میں زبان کی جو رمز شناسی ہے' الفاظ کے بطون میں پہنچ کر معانی کے گہر تلاش کرنے کا جو رجحان ہے' برہنہ گفتاری کی جگہ رمز وایما سے ان کی جو وابستگی ہے' الفاظ اور مفاہیم وجذبات کے درمیان وحدت پیدا کرنے کی جو اہلیت ہے'

لفظوں کو ہشت پہلو نگینوں کی صورت جڑنے اور انہیں شمع کی طرح روشن کرنے کی جو قدرت ہے ان سب کا مقسوم و مقدر یہی تھا کہ یہ سب خوبیاں اور قدرتیں نعتِ سرور کونینؐ کے سلسلے میں ان کے کام آئیں۔ تابش کے سفینۂ فن کو آخر ساحلِ محمدیؐ مل گیا......ہر زندہ چیز کی طرح ہمارے سخن کو بھی اپنی منزل کی تلاش رہتی ہے۔

قرآن حکیم ذات وصفاتِ سیدِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ اور مرقع ہے اور یہ مرقع تابش کے پیش نظر رہا ہے۔

محور ہستی فقط ذاتِ رسولؐ
دین و دنیا مصطفیؐ تا مصطفیؐ
نظمِ ہستی میں توازن کے لئے
ساری دنیا اور تنہا مصطفیؐ

ایسے شعر کہے نہیں جاتے عطا کئے جاتے ہیں۔ ہمارا دور نعت گوئی کا دور ہے کہ انسان خسران ونامرادی کی وادی سے نکلنا چاہتا ہے اور اس سعی وکاوش میں مصطفیؐ سراجِ منیر ہیں۔ میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں۔ ''ساری دنیا اور تنہا مصطفیؐ'' مقامِ نبوی سے آگہی کا اظہار اس قوت سے غالب واقبال کے بعد مجھے تابش کے ہاں اس طرح نظر آیا ہے۔

تیر قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشودِ آں ز کمانِ محمدؐ ست

(غالب)

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

(اقبال)

آیئے اب ذرا ''دین ودنیا مصطفیٰؐ تا مصطفیٰؐ '' اور ''ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰؐ'' کا مطالعہ قرآنِ حکیم کی روشنی میں کریں۔

سورہ الفتح میں سلسلہ کلام یہ ہے کہ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تاکہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آ جائے......اوراس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے وکفی باللہ شھیداً۔یعنی اللہ کی گواہی کافی ہے اور اللہ کی شہادت کے بعد ہی فرمایا گیا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔سورۂ سبا میں ارشاد فرمایا جاتا ہے ''**ومارسلناک الا کافتہ للناس بشیرا ونذیرا**'' اور اے محمدؐ ہم نے تم کو عالم انسانیت کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔یہی بشارت اور یہی تنذیر نظم ہستی میں توازن کی اساس پر ہے۔اور وہی ذاتِ محورِ ہستی ہوسکتی ہے جس کے لئے فرمایا گیا کہ اللہ رسولؐ پر شاہد ہے اور رسولؐ مومنوں پر شاہد ہیں......اور یہ شہادت ابدی ہے۔

تابشؔ صاحب نے نظم کی ہیئت کا بھی سہارا لیا ہے لیکن ان کی اکثر نعتیں ''غزل پیکر'' ہیں۔غزل جس کا ہر شعر اپنی دنیا آپ ہوتا ہے۔یہی وہ صنف ہے' جس کا ارتکاز اور وسعت ہمارے لئے عشقِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار کو سہل بنا دیتی ہے۔

حرا سے لے کے تا شہرِ مدینہ
نظامِ نور کا اک سلسلہ ہے

دوانتہاؤں حرا اور مدینہ کے درمیان تابشؔ نے نظام نور کے اس سلسلہ کی یادوں کے باب ہم پر کھول دیے ہیں جسے ہم اسوۂ حسنہ کہتے ہیں۔اور تابش نے ''نظامِ نور'' کی ترکیب کی مدد سے ہمیں یہ قرآنی سبق یاد دلایا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی پیروی ہی سے ہم رحم کے مستحق ہوسکتے ہیں (آلِ عمران)......اور اتباعِ رسولؐ ہی اللہ کی محبت کے دعوے کا ثبوت ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم۔(آلِ عمران)

نصیبِ شوق اگر ان کا نقشِ پا بھی نہیں
مری نجات کا پھر کوئی راستہ بھی نہیں

اتباع کے لئے نقشِ پا کا استعارہ کیسا بلیغ ہے۔

انسان دل اور دماغ کا مجموعہ ہے۔اس کے کارناموں اور اظہار میں انہیں دونوں اجزا اور عناصر کی یکجائی ملتی ہے۔تابشؔ صاحب کی نعت اسی یکجائی اور یکسوئی کا مرقع ہے۔ان کا قلب بھی مومن ہے اور ذہن بھی مومن......قلب وذہن' دونوں قرآنی اصطلاح فواد میں سمٹ آتے ہیں۔تابشؔ کی نعت فوادِ تابشؔ کی گواہی ہے۔محمدِ عربیؐ کی رسالت پر ان کے ایمان اور حضورؐ کی ذات سے ان کی محبت کی۔وہ قریہ محمدؐ میں اپنی پوری ذات کے ساتھ داخل ہوئے ہیں اور اب یہی قریہ ان کی شہرت کا نشان ہے۔وہ قریہ محمدؐ میں صبح و شام محمدؐ کی تقویم میں زندہ ہیں اور یہ وہ زندگی ہے جو آدمی کو ابدیت کی حدوں تک پہنچا دیتی ہے۔''خودی عشقِ محمدؐ سے خودنگر وخودگر وخودگیر'' بنتی ہے اور پھر آدمی موت پر غالب آ جاتا ہے۔

بہت کروٹیں اس زمانے نے بدلیں
نہ بدلے مگر صبح و شامِ محمدؐ

اس حقیقت تک پہنچ جانا اپنی زندگی پرشہادت دینا ہے۔

تابشؔ صاحب زبان کی صحت کے بارے میں نہایت سخت گیر اور روایت پرست ہیں۔وہ ان دو تین آدمیوں میں سے ہیں جنہیں میں دلّی کا لہجہ قرار دیتا ہوں لیکن عشقِ نبیؐ کے مرحلوں میں ایسے مرحلے بھی شامل ہیں جو زبان کے زنداں کو توڑ دیتے ہیں۔

جب دیارِ نبیؐ میں آیا ہوں
اک نئی زندگی میں آیا ہوں

یہ احساس بہت شدید ہے کہ دیارِ نبیؐ ایک نئی زندگی ہے۔تابشؔ صاحب اپنی غزل

میں نئی زندگی میں آنا کبھی نہ کہتے لیکن نعت میں ایک شدید جذبہ کے اظہار نے ان کے روایتی ذوقِ زبان دانی پر غلبہ حاصل کرلیا۔''نئی زندگی میں داخل ہونا'' کتنا محدود اظہار ہوتا۔عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ جب نبیؐ اپنے اظہار کے طریقے خود تراشتا ہے۔

تابشؔ صاحب کی نعت گوئی کے محاسن اور ان کے نعتیہ اشعار کے تاثر کو تفصیل سے پیش کرنا اس وقت میرے لئے ممکن نہیں۔ دوایک اشارے اور اپنے پسندیدہ شعروں میں سے چند آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

نعت گوئی صرف اظہارِ محبت نہیں' یہاں اخفائے محبت کی منزل بھی آتی ہے یا کم سے کم اپنے اظہار کے سیلِ رواں پر بند باندھنا پڑتا ہے۔تابشؔ صاحب نے یہ کام بعض مقامات پر ردیف سے لیا ہے۔ مثلاً ان کی یہ نعت۔

راحتِ دل' سکونِ جاں، یعنی
وہی غم خوارِ عاصیاں، یعنی

تابشؔ صاحب کی نعتیہ شاعری کی دوسری فتح تغزل اور لہجہ غزل کو سرکارِ رسالت پناہ کے مرتبہ سے ہم آہنگ بنانا ہے۔ یہ صفت ہمارے کئی ان اچھے نعت گو شاعروں کے ہاں بھی ملتی ہے جو غزل کی صنف میں امتیاز رکھتے ہیں لیکن تابشؔ صاحب غزل کو بے محابا اظہار کی صنف نہیں سمجھتے۔ جیسا کہ میں نے تمہیدی حصہ میں عرض کیا ہے کہ وہ برہنہ گفتاری کی جگہ رمزوایما کے آدمی ہیں۔ان کے رمزوایما میں ضبط ونظم کے بھی بہت سے پہلو ہیں جو کچھ تو ان کی زندگی کی قدروں کا نتیجہ ہیں اور کچھ فانی بدایونی سے وابستگی کا۔ چند شعر اس اشارہ کی روشنی میں ملاحظہ ہوں۔

گدائے مصطفیؐ کیا ہوگیا ہوں
میں آپ اپنی تمنا ہوگیا ہوں

کس قدر روشنی ہے طیبہ میں
اس قدر روشنی میں کیا دیکھیں

رشدوہدایت کی روشنی کی ارزانی نوعِ انسانی کے لئے اپنی جگہ' مگر یہ عاشق سب نور سے آگے کہاں جائے۔

کرم کے ساتھ قبولِ کرم کی طاقت بھی
حضورؐ مجھ میں حضوری کا حوصلا بھی نہیں

دوسرے مصرع میں حضور اور حضوری کی نسبتوں پر غور فرمایئے اور ''ح'' کے صوتی اثر سے خاموشی کی کیسی فضا تخلیق ہوئی ہے۔

ہر اک سانس کی آمد و شد رہے
مدینہ کی تاز ہوا کی طرح

اپنی زندگی کو فیضِ مدینہ اور نسبتِ مدینہ کے حوالے کردیا ہے۔

وہ بھی سایہ تھا تیرے دامن کا
میں اگر روشنی میں آیا ہوں

بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی' ہر چیز کا ایک شجرہ نسب ہوتا ہے اور مسلمان کی زندگی کی روشنی اور علم کا کوئی اعتبار نہیں اگر ان کا سلسلہ نسب دامنِ مصطفیٰؐ سے نہیں جاملتا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے وابستگی کی بنا پر جب خاکِ مدینہ کے ذرے کہکشاں معلوم ہونے لگتے ہیں تو وہ شخصیتیں کیوں نہ محبوب ٹھہریں جو ان کی رسالتؐ کی شاہد اور سچائی کی شہادتیں تھیں۔صدیق اکبرؓ کہ وہ:

ثانیٔ اسلام وغارو بدر وقبر

ہیں اور فاروقؓ تو فاروقِ بین الملتین ہیں' اور عثمانؓ غنائے رسالتؐ کا نقشِ جلیل ہیں اور حیدر کرارؓ تو پروردہ آغوشِ رسالتؐ ہیں۔ تابشؔ ان کے ذکر کے بغیر نعت کہہ بھی کیسے

سکتے تھے۔

تیری سچائی کا پرتو سینۂ بوبکرؓ میں
فکر کا مظہر تریؑ فاروقؓ کی دانش وری
تیرےؑ جودو لطف کا آئینہ عثمانِ غنیؓ
تیریؑ صولت کا مرقع جوشِ ضربِ حیدریؓ

تابش کے مرقعِ نعت میں شاعرانہ محاسن اور عقیدہ کی صحیح سمت...... دونوں چیزیں جمع ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سپاس ہم پر واجب ہے درود سلام ہو یا نعت...... یہ سب حرفِ سپاس کی منزلیں ہیں اور ہم پر اپنے رسولؐ او ران کے بعد کے اپنے اکابر کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ حرفِ سپاس بھی ہمیں عطا کئے گئے اور آدابِ ادائیگی حرف سپاس بھی سکھائے گئے اور سب کچھ کہہ کر آدمی کو یہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ۔

ان کے شایان ہو ایسا حرفِ سپاس
صرف لوح وقلم نے دیکھا ہے

اور لوح وقلم کے اس حرف سپاس کے نور کی چھوٹ تابش کی نعت پر پڑ رہی ہے۔

اے زمینوں کے فرش کو بچھانے والے اور اے آسمانوں کے خیموں کو ہمارے سروں پر بلند فرمانے والے اپنی بہترین رحمتیں اپنے عبداور رسول حضرت محمد مصطفیؐ پر نازل فرما' جس نے تیری نشانیوں کو رونق بخشی اور جس نے تیرے علم کی نگہبانی فرمائی اور جو تیری مخلوق کی طرف تیری سب سے بڑی آیت بن کر آیا......اور اے رب جلیل! تابش دہلوی کے حرفِ سپاس کو اپنی سرکار اور بارگاہِ نبوت میں درجۂ امتیاز عطا فرمانااور ان کی اس تمنا کو حقیقت بنادے۔

مرے ذہن ودل کو فراخی ملے
حرم کی کشادہ فضا کی طرح

میں تابش صاحب کاممنون ہوں کہ مجھے انہوں نے اس کارِ سعادت میں شریک بنایااور یوں مجھے بارگاہِ ذکرِ رسالتؐ میں چند لمحے گزارنے کا موقع ملا۔ خدا اس سلسلے کو جاری رکھے۔

(تقدیس/ تابش دہلوی، ۱۹۸۵ء، ادب گاہ، کراچی)

نسبت ارمان

حضرت ارمان اکبر آبادی مرحوم کا نام اپنی ساری نسبتوں کے ساتھ " مولوی بشارت علی خان آفریدی قادری سیمابی" تھا۔ مولوی وہ اپنے علم کے اعتبار سے تھے۔ " خان"اور " آفریدی" کے لاحقے ان کے نسب کا اظہار کرتے ہیں، قادریہ سلسلہ سے تعلق نے انہیں قادری بنایا اور حضرت سیماب اکبر آبادی سے تلمذ کی بنا پر وہ سیمابی ٹھہرے۔ ویسے تصوف اور تزکیہ نفس نے ان کی فطرت کی سیمابیت کو مسخر کر کے انہیں سکون عطا کردیا تھا اور یاد رسول اکرام ﷺ نے انہیں "قراری" بنادیا تھا در رسول کریم ﷺ ان کا وطن ہے۔

بنی کریم ﷺ کی معرفت تصوف اور تزکیہ نفس کا پہلا مرحلہ بھی ہے اور آخری مرحلہ بھی۔ مقام محمدی ﷺ کی طرف سفر کرنے والوں کو نفس مطمئنہ اور زبان حمد عطا کی جاتی ہے حمد کی شایاں وہی ذات ہے جو حسن و تناسب کا آخری نقطہ ہو اور جس کی ذات کے ساتھ اس کی صفات بھی شہکار جمال و توازن و تناسب ہوں۔ اللہ کی یہ صفات اس کارگہ جمال و جلال میں ہر سو منعکس ہیں۔ یوں حمد کی سزاوار ذات اپنا اظہار اس سطح پر کرتی ہے کہ اس کے اختیاری محاسن کی جھلکیاں ہمیں بے ساختہ حمد کرنے پر مجبور کردیتی ہیں اور اس عمل میں ہمارا سارا وجود شامل ہوتا ہے۔حمد کے لئے لازم ہے کہ جس ذات کی حمد کی جارہی ہو اس کی صفات اور کمالات کا پوری طرح ادراک اور علم ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا یہ ادراک وعلم حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات کرامی کے طفیل ہمیں نصیب ہوا۔ وہ رسول جو " احمد" تھا اور بے حد حمد کرنے کا عمل جس کا اسم صفاتی

ٹھہرا۔ وہ رسول جو " محمد" تھا۔ اس نے اس درجہ اپنے منبع و مصدر کی حمد کی کہ خود " وجہ حمد و ستائش" بن گیا۔ وہ رسول جو مقام محمود پر ابدأفائز ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ حُزن و خوف اس کے جوار میں قدم نہیں رکھ سکتے، اور یہی مقام دوسروں کے لئے باعث سکون و قرار بنتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پہنچ کر ذات رسالت مآب ہمارے لئے حصار حفاظت بن گئی ہے۔

حضرت ارمان اکبر آبادی مرحوم کی نعتیہ شاعری میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی پاسداری کے ساتھ ساتھ معبود و عبد کے اس رشتہ کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ رشتہ جو حمد، حامد، محمود، احمد اور محمد کا احاطہ کرلیتا ہے یوں دیکھیے تو حضور ﷺ کی ذات و صفات کی بنا پر آپ کی تعریف بھی لغوی طور پر حمد ٹھہرتی ہے، لیکن توحید کی امانت ہمارے سینوں کے سپرد کی گئی ہے اور اس امانت کا تحفظ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اس حمد کے لئے کوئی اور اصطلاح استعمال کریں اور یہی اصطلاح نعت ہے۔ نعت اس ذات اعظم کی مدح و حمد ہے جس نے اپنے بارے میں ان حقائق کا انکشاف کر کے ہمارے لئے اپنی معرفت کے راستے کو آسان بنادیا کہ:

اول ما خلق اللہ نوری کنت نبیا و آدم بین الماء والطین

" اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کی تخلیق فرمائی۔ جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان (تخلیقی مراحل سے گزر رہے) تھے، میں اس وقت بھی نبی تھا۔"

مولانا بشارت علی خان قادری، اکبر آبادی مرحوم کی نعت گوئی میں مقام محمدی کی تفہیم کے ساتھ ساتھ وہ دلِ ناصبور بھی ہے جسے شکیبائی کچھ اور مضطر بنادیتی ہے۔

فنّی طور پر جناب ارمان کی بیشتر نعتیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں، اگرچہ انہوں نے مخمس اور مسدس بھی لکھے ہیں اور دوسری اصناف کے ذریعے بھی اپنا اظہار کیا ہے۔ ارمان صاحب نے اپنی نعت کو بھی غزل ہی کہا ہے اور بجا طور پر۔ غزل روح کا

ترانہ ہوتی ہے اور عشق سے اس ترانے اور نغمے میں وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے تغزل کہتے ہیں۔ نعت اس اصطلاح (تغزل) کو ایک نئی بلندی اور گہری معنویت عطا کرتی ہے۔ غزل کی اشاریت اور ایمائیت تو ہر اس شعر کو نعت کی حدود میں شامل کر دیتی ہے جو محدود سے سفر کرتے ہوئے لامحدود کو چھو لیتا ہے، خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو۔

میں یہ نکتہ اس سے پہلے بھی دوسری تحریروں میں بیان کر چکا ہوں مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجیے:

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیے

آج اس شعر کو سن کر ہمارا ذہن صرف اپنے نبیﷺ کی طرف منتقل ہوتا ہے، تجمل حسین خاں کی طرف نہیں کیونکہ یہ لباس شعر ان کی قامت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا۔ اسی طرح احسان دانش مرحوم کا یہ شعر ذکر رسول کے غنچے کی چٹک کی طرح ہے۔

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

ہواؤں اور تاریخ کے عوامل کا یہ سفر صدیوں سے جاری ہے اور جاری رہے گا۔حضرت ارمان کی نعتیہ غزلوں میں کتنے ہی ایسے اشعار ہیں جن میں نبی آخر الزمان ﷺ کا اسم گرامی نہیں آیا، نہ آپﷺ کی زندگی کے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن ان اشعار میں جذبہ کی بے کرانی اور اُس مرکز صدق و صفا سے شاعر کا رشتہ ان کی جہت کو متعین کرتا ہے۔ ان اشعار میں " لامکانیت" اور "لازمانیت " کی جو نمود ہے وہ انہیں نعت کے اشعار بنا دیتی ہے۔

تجھے تسکین جاں کہہ کر عجب تسکین ہوتی ہے
ترا سکہ رواں جاں پر، ترا رشتہ رگِ جاں سے
انہی کا نام سن کر آ گیا تھا بزم امکاں میں
انہی کا نام لے کر جا رہا ہوں بزمِ امکاں سے

دوسرا شعر سہل ممتنع اور حسن تکرار کی ایک نمائندہ مثال ہے۔ یہ خوبیاں صرف فنی اور لفظی محاسن نہیں، بلکہ یہ الفاظ پر جذبہ کی فتح کی علامت اور نشان ہیں۔ دوسرا شعر فانی کے اس نہایت معروف اور مشہور شعر کی یاد دلاتا ہے۔

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

ممکن ہے کہ حضرت ارمان کے سامنے فانی کا یہ شعر رہا ہو، لیکن عشق رسولﷺ نے ان کے شعر کو عجب سیاق و سباق دے دیا ہے۔ ایسا سیاق و سباق جس نے اس شعر کے کینوس کو بڑی وسعت عطا کر دی ہے۔

عشق جب لفظوں میں ڈھلتا ہے تو شعر کے آہنگ سے دوبارہ نئے انداز سے آشکار ہوتا ہے۔ جذبہ کتنے مطلعوں سے اُبھرتا اور اپنی نقش بندی کرتا ہے۔ ارمان مرحوم کی نعتوں کا آہنگ ایک ایسی غنائی کیفیت اور موسیقی اپنے دامن میں رکھتا ہے جسے " اجتماعی موسیقی" کہہ سکتے ہیں، یا جدید نفسیات کی مدد سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اشعار " اجتماعی لاشعور" کی تخلیق ہیں۔ کچھ بحریں ایسی ہیں جو اپنے ارکان کی نغمگی کے ساتھ کئی نسلوں سے ہماری فضاؤں میں گونج رہی ہیں......ارمان صاحب کی کئی نعتیں ایسی ہی بحروں میں ہیں۔

ہائے میرا خواب میں وہ روئے انور دیکھنا

....

ہر شے میں جھلکتی ہے سرکار کی رعنائی

....

وہ ماہِ رسالت کیا کہنا، وہ مہر نبوت کیا کہنا

ان بحروں کی مانوس اور آشنا نغمگی جیسے ہمیں ذکر حضورﷺ کی محفلوں میں پہنچادیتی ہے جہاں لبوں سے نکلنے والے الفاظ خوشبو اور روشنی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔

حضرتِ ارمان کی نعتیہ غزلوں میں وہ قرآنی اشارے، علامتیں اور مضامین بھی کثرت سے موجود ہیں جو اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک حصہ بن چکے ہیں، لیکن ان علامتوں اور اشاروں کو انہوں نے اس طرح استعمال کیا ہے کہ یہ علامتیں ان کے ذاتی تجربے کی حدود میں داخل اور شامل ہوجاتی ہیں۔

رتبہ تو خدا جانے، ہم نے تو یہ جانا ہے
طٰہٰ ہے لقب ان کا، یٰسین خطاب ان کا
واللیل حجاب ان کا، والشمس نقاب ان کا

تمھاری رفعت کا کیا ٹھکانا، گزر وہاں تک ہو کب کسی کا
مکان قوسین ڈھونڈھ مارا، تھکے ہیں سب لامکان والے

قرآن کریم کے حروفِ مقطعات کے مفاہیم اللہ کو معلوم ہیں یا اس کے رسول کو ،لیکن اس امت نے ان حروف کو ذات محمدیﷺ کا استعارہ جانا ہے۔

وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی قرآں وہی طٰہٰ

اور اقبال کی یہ دلیل بھی کتنی روشن ہے۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول سے اس کا دامن بندھا ہوا ہے۔

" المومنین! ہمیں بنی کریمﷺ کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتایئے۔"

" کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟"

قرآن عظیم کے الفاظ و اصطلاحات نے سراپائے رسول کے ذکر کے لئے فجر و لیل، شمس وقمر کو علامتوں کے مرتبہ تک پہنچادیا۔ ہمارے ایک دوست نعت میں سراپا اور " ذکر گیسوورخسار" کے بہت خلاف ہیں۔ میں اس نقطۂ نظر سے اپنے اختلاف کا اظہار پہلے بھی کرچکا ہوں۔ " شمائل نبوی"حدیث کے ایک مستقل موضوع کا نام ہے۔ صحابۂ کرام حضورﷺ کے رخساروں میں سورج بلکہ سورجوں کو تیرتے ہوئے دیکھتے تھے جن کی چھوٹ ہمارے درو بام سے سقف فلک تک پڑتی تھی، اور ہم چودہ صدیوں سے زیادہ کے فاصلے پر کھڑے یہ سوچتے ہیں کہ وہ لب و رخسار کیسے تھے؟ اور اس کا جواب اس تمام لطافت وحسن سے عبارت سے ہوتا ہے جو ہماری شخصیت کی گرفت میں آسکے۔

نعت گوئی میں ایک مسئلہ " تو" اور " تم"کے استعمال کا ہے۔ بعض صاحبان اپنے افتخار کے طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ " ہم نے نعت میں کہیں تو اورتم کے الفاظ استعمال نہیں کیئے۔" کوئی لفظ خود بے قدر یا کم قدر نہیں ہوتا۔ انہیں اختیارنسبت سے حاصل ہوتا ہے۔ ابوبکر کو صدیق، عمر کو فاروق، عثمان کوغنی اور علی کو باب العلم کس نے بنایا؟ اس نسبت نے، اور یہی نسبت " تو" کو ہماری زبان کا سب سے معتبر لفظ بنادیتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہمارا تعلق محض ضابطہ کا نہیں۔

یہ تعلق تو نغمہ روح اور حدیث شہ رگ ہے۔ اس قربت کے بار کو " تو" کا لفظ ہی سہار سکتا ہے۔ یہی لفظ اس رب جلیل سے بھی ہمارے تعلق کے اظہار کی اساس بنتا ہے جو رگ جاں سے بھی قریب تر ہے۔ حضرت ارمان کی نعتوں میں تواورتم، دونوں ضمیروں کا اعتبار دیدنی ہے۔

کلامِ اولین بھی تم، پیامِ آخری بھی تم
جہاں کی ابتدا تم ہو، جہاں کی انتہا تم ہو

....

دل میں میں ہے یاد تیری، لب پر ہے نام تیرا

اب دین ہے تو یہ ہے، ایمان ہے تو یہ ہے

آخری شعر اردو غزل کے کلاسیکی لہجے میں اس حقیقت کا اظہار ہے جسے اقبال نے اس طرح ادا کیا ہے کہ فارسی سے عہد جدید کی اجنبیت کے علاوہ یہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

بہ او گر نہ رسیدی تمام بولہبی ست

جناب ارمان کی نعتوں کے مطالعہ کے بارے میں شرحِ صدر کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ حضور مصطفیٰ ﷺ تک رسائی حاصل کرنے والوں میں ان کا نام شامل ہے۔ اپنی نعتوں میں کہیں کہیں وہ اس وادی میں بھی پہنچ گئے ہیں کہ احمد اور احد کے فرق کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اللہ کی شانِ رحیمی سے امید یہی ہے کہ اسے اس لغزش مستانہ پر پیار آیا ہوگا۔

(سروش سدرہ/ارمان اکبرآبادی،۱۹۸۶ء، مرتبہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان)

نعت رسالت مآب ﷺ اور اقبال صفی پوری

آج نعتیہ شاعری اور نعتیہ مشاعرے ہماری ثقافت اور تہذیبی زندگی کا حصہ ہیں۔ ان کے فروغ اور ہمہ جہتی وسعت میں بہت سے عوامل شامل ہیں۔ میں اقبال صفی پوری کو ان عوامل میں شامل کرتا ہوں...... بات ان کی نعتیہ شاعری کی عشقیہ لے اور ''روحانی تغزل'' تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے نعتیہ شاعری کے لئے ہماری سماعت کی تسکین اور تربیت کی خاطر نعتیہ مشاعروں کے ادارہ کی طرح ڈالی۔ اب پاکستان کے مختلف شہروں میں عوامی سطح پر سالانہ نعتیہ مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ ان مشاعروں کا شجرہ اقبال صفی پوری کی مساعیِ جلیلہ سے جاملتا ہے۔

سعادتوں کا یہ سلسلہ محض اتفاق سے عبارت نہیں۔ یہ سعادت ان کی خاندانی روایت اور ان کی میراث ہے۔ اقبال صفی پوری کے دادا حضرت شاہ خلیل احمدؒ صوفی تھے اور ان کا دل سرچشمۂ صفا تھا۔ اس سرچشمے کا تموج اکثر شاعری کا روپ دھارلیتا اور ان کے جذبات لفظوں کی مدد سے قلب کی گہرائیوں سے نکل کر زبان اور کاغذ کی سطح کا رخ کرتے......پھر ان کے عشق نے ان کے لئے زبانوں کے حدود مسخر کردیئے تھے۔ وہ اردو فارسی اور ہندی زبانوں میں شعر کہتے۔ ان کے مجموعہ ''خیابان خلیل'' میں ایسے کتنے ہی گلہائے سرمدی نظر آتے ہیں جن میں صبغتہ اللہ بھی ہے اور حب رسول اکرمؐ کی خوشبو بھی۔ اقبال صفی پوری کے نانا حضرت عزیز صفی پوری ہمارے شعرائے متاخرین کے طبقۂ اول کے معتبر فارسی گو شعراء میں شامل ہیں۔ وہ غالب جو اپنے قاری کو دعوت دیتے تھے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

غالب بھی عزیز صفی پوری کے نقش فارسی کی دل آویزی کے قائل تھے۔

اقبال صفی پوری کو تصوف اور شاعری کی دولتیں میراث میں ملی ہیں۔ اگر چہ ان کی زندگی میں ان کی ترتیب معکوس رہی ہے لیکن اب ان میں نئی نسبت اور تناسب پیدا ہوگیا ہے۔ ہمارے بچپنے میں موسم سرما کا سب سے اہم سلسلہ واقعات سالانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جگر مراد آبادی' حفیظ جالندھری' ماہر القادری' احسان دانش اور شعری بھوپالی کے بغیر مشاعرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان لوگوں کے بعد ہمارے لڑکپن میں راز مراد آبادی' مجروح سلطان پوری اور نشور واحدی کے نغمے فضاؤں پر چھانے لگے اور انہیں کے کچھ بعد شکیل بدایونی اور اقبال صفی پوری کی آواز اور کلام کا دور شروع ہوا۔ اس فہرست میں فنا نظامی اور خمار بارہ بنکوی کے نام بھی شامل کر لیجئے۔

میں نے اقبال صفی پوری کو اسی عہد میں دیکھا۔ ان کے کلام کی موسیقیت اردو زبان کے اس انداز نے جو مہذب گفتگو سے قریب تر ہے' مجھے متاثر کیا......دیداور شنید کا یہ سلسلہ پاکستان بننے کے بعد تک جاری رہا اور پھر یہ دیدوشنید ذاتی ملاقاتوں اور شناسائی میں بدل گئی۔ اس پوری مدت میں' میں نے دیکھا کہ اقبال صاحب میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ انکسار ہے۔ وہ رشتوں کا احترام کرتے ہیں۔جب انہیں معلوم ہوا کہ میں (حضرت) ثاقب کانپوری کا بیٹا ہوں تو ان کے رویے اور برتاؤ میں شفقت' محبت اور احترام کا کچھ ایسا امتزاج نظر آنے لگا جس کو کوئی نام دینا میرے لئے مشکل ہے۔

اقبال صفی پوری نے مشاعروں کو بہت کچھ دیا اور مشاعروں سے پایا بھی۔ بات کو صفائی سے کہنا' شاعری کا غنائی لہجہ' آشنا مضامین میں اضافہ معانی کی کوشش' یہ سب پہلوان کی شاعری میں موجود ہیں۔ اس شاعری میں ان کی غزل بھی شامل ہے اور نعت بھی۔ اقبال کے اس نعتیہ مجموعہ کی بیشتر بلکہ تمام نعتیں غزل کی ہیئت میں کہی گئی ہیں۔

انہوں نے غزل کے پیکر کو مدحتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبائے نور عطا کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غزل سے ان کی طبیعت کو کیسی مناسبت ہے۔ بات صرف ہیئت اور تکنیک تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ انہوں نے غزل کی علامتوں اور اشاروں سے اپنی نعت گوئی میں کام لیا ہے۔''معاملۂ سپردگی' آرزو جستجو' نغمہ' روشنی' سجدہ' اور در'' وغیرہ لیکن ان کی نعت میں ان علامتوں کا سیاق وسباق ہی نہیں بلکہ منظر وپیش منظر اور معنوی سطح تک ......ہر چیز بدل جاتی ہے' جس طرح حضورؐ کی نظر دلوں کی دنیا بدل دیتی تھی اسی طرح انؐ کا ذکر لفظوں کی سطح اور معانی کو بدل کر نئی بلندیاں عطا کر دیتا ہے۔اس موقع پر ایک نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا' وہ یہ کہ جب بھی کوئی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرے گا وہ حمد یا نعت کی وادی میں پہنچ جائے گا۔ جب کسی عام آدمی کی تعریف اس کے احوال اور ظرف سے زیادہ کی جائے گی تو وہ اس مدحت کا مصداق نہیں رہے گا اور مدحت شاعر کے ارادے اور شعور کے بغیر دربار رسالتؐ کا رخ کرلے گی۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

زباں پہ بار خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

آج ہر پڑھنے والا' سننے والا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ میں اپنی عقیدتوں کا نذرانہ پیش کرنے والا اس شعر کو نعت کا شعر قرار دیتا ہے۔ اور جاننے والوں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ بظاہر یہ شعر کسی تجمل حسین خان کے لئے کہا گیا تھا۔ احسان دانش مرحوم سے ان کی وفات سے کوئی دس بارہ دن پہلے میری ملاقات ہوئی' انہوں نے ایک شعر سنایا۔

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

میں نے بے ساختہ کہا......''نعت کا کیا اچھا شعر ہے''...... وہ قدرے خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ ٹھیک کہتے ہو......سچ تو یہ ہے کہ تخلیقی عمل بہت پیچیدہ اور تہ بہ تہ اپنے قوانین آپ مرتب کرنے والی شے ہے۔ اس میں آدمی کی پوری ذات وابستہ ہوتی ہے۔ اختیار اور جبر' شعور اور لاشعور' پوری واضح تصویریں اور الفاظ کے اپنے اظہار کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔

اقبال صفی پوری کی شخصیت کا یہ پہلو جسے ہم دینی پہلو کہتے ہیں۔مدتوں خود ان پر پوری طرح واضح نہیں' لیکن اس کا اظہار کسی نہ کسی پہلو ہوتا رہا۔

خون بولتا ہے اور......عشقِ خدا رسولؐ ان کے خون میں گردش کرتا رہا ہے۔

اب ذرا ان کی غزل کے یہ چند عشقیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔کیا لفظ نور عشق الٰہی اور ''روشنی'' مدحتِ رسولؐ سے منور نہیں ہے۔

مری زندگی ہے محکم' مرا عزم ہے مکمل
میں جہاں بھی سر جھکادوں' وہیں تیرا آستانہ
میری زندگی ترا غم' ترا غم متاعِ عالم
مرے ساتھ صرف تو ہے' ترے ساتھ ہے زمانہ

ٹھوکریں کھاکے آئیں گے آخر یہیں' ہم جہاں جائیں گے ہم جدھر جائیں گے
آپ کو چھوڑنا کوئی آسان ہے' آپ کو چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے
اس قدر دل شکستہ ہیں کیوں اہل غم 'نسبتِ غم تو خود ہے دلیلِ کرم
آنسوؤں سے جودامن بھرے ہیں ابھی' ایک دن موتیوں سے بھی بھرجائیں گے

میں ساقی کو دیکھوں کہ دنیا کو دیکھوں
یہ دنیا تو یونہی بدل جائے گی

میں کرلوں ہر تمنا سے کنارا
مجھے مل جائے بس دامن تمہارا

بے سہارا جو کوئی آبلہ پا ہوتا ہے
اس قدم پر ترا غم راہ نما ہوتا ہے

چند شعر کسی سعی وکاوش کے بغیر اقبالؔ صفی پوری کے مجموعہ غزل ''شاخِ گل'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے نظر سے گزرے اور یہ شعر اس نکتے کی وضاحت کرتے ہیں بلکہ اس کی دلیل فراہم کرتے ہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

اقبالؔ صفی پوری کی نعت ان کی ذات کا اظہار ہے۔ یہ آج کے ادبی فیشن سے عبارت نہیں بلکہ ان کی روح کا نغمہ ہے۔ وہ نغمہ جسے وہ نغمۂ نور کہتے ہیں۔

ابھر رہی ہیں شعاعیں ہر سُو کھلے ہیں لب مدحت نبیؐ میں
وہ نغمۂ نور چھیڑ اے دل کہ ڈوب جاؤں میں روشنی میں

حضور نبی کریم کے حسنِ جاوداں اور حسن ہمہ جہت کو دیکھنے والوں نے اپنے ظرف کے مطابق دیکھا۔ جمالِ یار پر نظر کا ٹھہرنا ہی کیا آسان ہے......؟ معاملہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ جمال پھول بن جاتا ہے اور کبھی رخسار اور رخساروں میں سورج تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔حسنِ حجاب نظر بنتا ہے مگر یوں کہ حسن کا ایک نیا پہلو سامنے آجاتا ہے' کبھی ''ہجوم لالہ وگل'' کبھی ''خندۂ برق وشرر'' آپ شمائل مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ فرمائیں تو یہی عالم نظر آئے گا' چودہ سو سال کی دوری اور مسافت پر کھڑے اقبالؔ صفی پوری اور ان کے معاصر حقیقی نعت گو شعراء بھی جلوہ رسولؐ کو اپنے اپنے ذوق آرزو اور احوال وظرف کے مطابق دیکھ رہے ہیں۔

اقبالؔ صفی پوری کے ہاں جلوہ محمدیؐ کی جھلکیاں مختلف عنوانوں سے نظر آتی ہیں لیکن

ذات رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں ان کا سب سے اہم اشارہ اور علامت ''نور'' ہے۔ وہ اسی نور کی روشنی میں ڈوبنا بھی چاہتے ہیں اور زندہ بھی رہنا چاہتے ہیں۔ یہی نور زندگی کے راستوں اور قرینوں کو منور کرتا ہے......قرآن مجید نے بھی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور قرار دیا ہے۔

قدجاء کم من اللہ نور و کتاب مبین. (المائدہ)

نور اپنے وجود پر آپ دلالت کرتا ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک معجزہ اور دلالتِ نبوت تھی......اس زندگی کا ہر لمحہ ایسا روشن اور واضح تھا کہ اس کی روشنی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے کسی اور روشنی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری زندگی کا ایک ایسا مرکزی نکتہ ہیں کہ ہم اشیاء کو انؐ کے نور میں دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اشیاء ہمیں انؐ کے حضور لے جاتی ہیں...... چیزوں کو یا اسی نور سے بہا حاصل ہے' یا پھر چیزیں اسی کی تلاش میں مصروف ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں۔

ہر کُجا بینی جہان رنگ وبو
آں کہ ازخاکش بروید آرزو
یا زِنور مصطفیٰ او رابہاست
یاہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہر شے کے مقام کا تعین کرتا ہے۔

فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسمِ بلالی وطرزِ بولہبی

اقبال صفی پوری شناخت نور کی اسی منزل پر فائز ہیں اور ان پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس نور کی کرنیں انہیں اپنے آغوش میں لئے رہتی ہیں۔ یہ عشق رسول کی جزا ہے۔

یہ عجب معاملہ ہے' یہ عجب سپردگی ہے
میں کسی طرف بھی جاؤں مرے ساتھ روشنی ہے

روشنی کے ساتھ ساتھ وہ خوشبوئے رسالت کے ادراک سے بھی سرفراز فرمائے گئے ہیں' اور یہ شعور بھی انہیں عطا ہوا ہے کہ حضورؐ ہماری زندگی کا معیار ہیں۔ وہی ہیں کہ جن کا اسوۂ حسنہ ہمارے اندازِ زیست کے قرینوں کا تعین کرتا ہے۔

ہے عجب حسین و دل کش مری زیست کا قرینہ
مری آرزو محمدؐ میری جستجو مدینہ

سروری صرف اس ذات بے ہمتا کو زیبا ہے اور ہر سجدہ بندہ مومن اسی کے لئے مخصوص ہے' لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب اور دیار میں جیسے سر میں ایک سجدہ مچلنے لگتا ہے اور الحمد للہ کہ فرزانگی' توحید اور شریعت کے آداب اس سجدہ بے تاب کی ادائیگی کو روک کر اس جذبے کو ہماری ذات کی شناخت بنادیتے ہیں۔ اقبال صفی پوری نے اس مرحلہ شوق کو کیا خوب بیان کیا ہے۔

نہ سر سے جدا ہو' نہ کھل کر ادا ہو
اک ایسا بھی بے تاب سجدہ ہے سر میں

اور اس سجدہ کی کچھ کچھ ادائیگی ان کی نعت گوئی ہے۔

(رحمت لقب/ اقبال صفی پوری، ۱۹۸۸ء، مرکز نعت، کراچی)

مستقیم لہجے کی شاعری

آدمی کی شناخت اپنے بچوں، اپنے دوستوں اور اپنے کلام سے ہوتی ہے، بچے اُس کی تعمیری قوتوں اور اقدار کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ دوست اس کے انتخاب کا پیمانہ ہوتے ہیں اور کلام اس کے ذہن وفکر کا دریچہ ہوتا ہے۔ یہاں " کلام" کا لفظ گفتگو اور زبان کے ذریعے اظہار کی تمام صورتوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے، اور اگر کوئی شخص شاعر بھی ہے تو اُس کی شاعری اُس کے مُطالعے، مشاہدے، سلیقۂ زیست و اظہار اور تجربوں کا احاطہ کرلیتی ہے۔

میں نے جناب تہورعلی زیدی کو اُن کے دو بچوں کے آئینے اور اُن کی شاعری کی دنیا میں دیکھا ہے اور ہر اعتبار سے انہیں بامراد پایا ہے۔ جو احتیاط اور سلیقہ وہ اپنے شعروں میں، الفاظ کے انتخاب میں برتتے ہیں وہی ثقافتی وضع داری ڈاکٹر ظفر زیدی اور ڈاکٹر مہ جبیں زیدی کے کردار وگفتار میں بھی ہے۔

جناب تہورعلی زیدی نے اپنی نسبی نسبت کو اپنا تخلص قرار دیا ہے۔ یہ نسبی تفاخر کی صورت نہیں بلکہ اُن اقدار سے اپنے رشتے کے اظہار کی صورت ہے جو اس نسب نامہ سے وابستہ ہیں خدائے سخن میرؔ نے کہا تھا ؎

دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسولؐ کا
جلوہ نہیں ہے نظم میں حُسنِ قبول کا

اس مجموعے میں نعت کے شعر کسی رسم کی تکمیل کی خاطر نہیں پیش کئے گئے ہیں بلکہ جناب زیدیؔ کے لئے حضور اکرمؐ کا ذکر نشاط رُوح کی سبیل ہے، اور یہ اُسی وقت ممکن

ہوسکتا ہے جب کسی شاعر کے لئے ذات رسالت مآبﷺ ۱۴۶۱ سال کے فاصلے پر دل کی دھڑکن کا درجہ رکھتی ہو۔ جناب زیدیؔ کے لئے ختم الرسلﷺ کی ذات اور ان کا وجود آج بھی زندگی بخش ہے اور اس کارواں کے امیر کارواں اور اس مے کدے کے ساقی محمد عربیﷺ ہی ہیں :

رسائی جس کی ہے عرشِ علیٰ تک
وُہی اپنا امیرِ کارواں ہے
نہ پُوچھو اُس کے استغنیٰ کا عالم
محمد کا جسے دامن ملا ہے

فکر ونظر کا یہی سلسلہ جناب زیدی کی غزلوں میں نظر آتا ہے، یہ ایک ایسے شخص کی غزلیں ہیں کہ جس نے استغنیٰ کو اپنا لیا ہے، زندگی جس کے لئے تحیر اور تماشا ہے اور وہ اپنے آپ کو دنیا میں گم نہیں کرتا جو جلوۂ زخم خنداں کو مشعل بنانے کا ہنر جانتا ہے۔ دل کو یہ مرکزیت دیے بغیر غزل کہنا ممکن نہیں، لیکن جناب زیدیؔ نے اپنے دل کو آئینہ جہاں نما بنالیا ہے۔ انہوں نے چشم وا کے ساتھ زندگی اور زمانے کو دیکھا ہے، پھر اس عکس کو اپنے دل میں آباد کیا ہے اور غزل میں اس کا اظہار کیا ہے۔ یہ میرؔ صاحب کی روایت ہے کہ دلی دل میں گم ہوجائے۔ یہی وہ غزل ہے جو داخلیت اور خارجیت یا موضوعیت اور معروضیت کی اصطلاحوں کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ اس میں اپنی ذات بھی ہے اور زمانہ بھی۔ زیادہ واضح طور پر یہ کہنا درست ہوگا کہ زمانہ اور اس کے احوال شاعر کی ذات سے گزر کر غزل کی بارگاہ میں بار پاتے ہیں۔ یہ ذات کی کلیت اور سا لمیت کی شاعری ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں، اور یہ عرض کرتا چلوں کہ ان اشعار کے انتخاب میں کسی کاوش سے کام نہں لیا گیا ہے بلکہ تحقیقی منہاجیات کی اصطلاح میں "Random sampling" (اتفاقی نمونہ بندی) سے کام لیا گیا ہے :

میں تو گلشن میں بھی اس طرح رہا ہوں اے دوست
زندگی جیسے گزارے کوئی زنداں کے قریب

(اور یہ شعر کاغذ پر لکھتے ہوئے بنی کریم ﷺ کی حدیث یاد آئی الدنیا سجن المومن۔ دنیا مومن کے لئے زنداں ہے۔)

زہے زلفِ پیچاں زہے روئے تاباں
کبھی دل ہے کافر، کبھی دل مسلماں

زلف اور رخ ایک دوسرے سے کتنے قریب ہیں، جیسے ایک دوسرے کا تکملہ اور ضمیمہ ہوں۔ پھر زلف ان ظلمات کا اشارہ ہے جو نورِ حقیقت کے راہی کے راستے میں ہیں، اور زلف سے گزر کر وہ رخ کے نور تک پہنچتا ہے۔ کفر و اسلام میں بھی یہی قربت ہے۔ لا کے بعد الا اللہ۔

اور جو غزل اب نظروں کے سامنے آئی ہے اسی کے انتخاب پر اس تحریر کا اختتام کیونکہ یہ شعر شاعر کی زبانی اس کی ذات اور اس ے معاشرے پر تبصرہ کا درجہ رکھتے ہیں:

الگ رکھتا ہوں دنیا بھر سے انداز بیاں اپنا
کہ مستثنیٰ ہے صوت زیروبم سے ساز جاں اپنا
مرے احساس بربادی کا عالم پوچھتے کیا ہو
کوئی میری طرح جلتا نہ دیکھے آشیاں اپنا

اپنے انداز بیان کے بارے میں صوت زیروبم مستثنیٰ ہونے کی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا لہجہ مستقیم ہو، ورنہ زیر و بم کا سہارا لیے بغیر بات اور کون کرے گا؟ اور دوسرے شعر میں تو مجھے اپنے وطن کی تاریخ نظر آتی ہے۔ خدا اس احساس بربادی کو یقین مستقبل میں بدلے۔ مگر یہ تو اجتماعی انداز حیات اور رویہ بدلے بغیر ممکن نہیں۔ آرزوؤں سے تقدیریں نہیں بدلا کرتیں۔ (نمودِ صبح/تہور علی زیدی، ۱۹۸۸ء)

صحیفۂ نعت

صحیفۂ حمد کے بعد جناب لطیف آثر صحیفۂ نعت کا تحفہ لے کر دنیائے ادب میں آئے ہیں ان کی غزلوں کے دو مجموعے شائع ہو کر سُرمۂ اہلِ نظر کا درجہ پا چکے ہیں۔ اس کے بعد آثر صاحب نے نہایت نُدرت اور انفرادیت کا حامل مجموعہ آئینے مرتب کیا' جس کے ہر شعر میں آئینہ کی علامت موجود ہے۔ جب میں نے یہ مجموعہ دیکھا تو نجانے کیوں یہ عرض کیا کہ نعتیہ مجموعہ اس سے پہلے شائع ہوجائے تو کیا خوب ہے۔ آثر صاحب نے اپنی آنکھ بند کی اور دل کو انجمن کی جگہ خلوت کدۂ محمدیؐ بنایا اور اس مدت حضوری میں دو نعتیہ مجموعے ''چراغ راہِ حرم'' اور ''پیکر نور'' وجود میں آ گئے۔ ان مجموعوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے ان سے عرض کیا کہ اردو میں حمد یہ مجموعے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیا خیال ہے؟ چپ ہوئے مگر مہینے دو مہینے کے بعد جب وہ تشریف لائے تو حمد یہ مجموعہ ان کے ساتھ تھا۔ اس مجموعے کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ کے اسمائے حسنی ہی ردیف یا ردیف کا حصہ ہیں یوں ہر حمد کسی ایک صفت الٰہی کو ہماری توجہ اور وجدان کا مرکز اور محور بناتی ہے۔

میں ان مجموعوں کی اشاعت کا منتظر تھا کہ میرے استاد ایک اور مجموعہ کے ساتھ تشریف لائے۔ کہنے لگے' لو! یہ دوسرا ''نعتیہ مجموعہ تیار ہوگیا'' ''صحیفہ حمد'' اگر ''لا الہ الا اللہ'' کا عکس ہے تو صحیفہ نعت' محمد ''رسول اللہ'' کا ورد ہے اس کی ہر نعت کی ردیف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی پاک نام ہے۔ یوں زیر نظر مجموعہ صحیفہ حمد کا تسلسل اور

توسیع ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ہر آن بدلتی ہوئی اس کی کسی تجلی اور شان کا تذکرہ ہے۔ یوں یہ نام ہمارے ذکر کا حصہ ہیں۔ اسی طرح انبیائے کرام کو بھی پیارے پیارے اچھے اچھے ناموں سے سرفراز فرمایا گیا اور ان کے ساتھ یوں خالق کائنات نے ایک لطیف انداز میں اپنے رشتہ' تعلق اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ قاضی عیاضؒ کا ایک نہایت دقیق نکتہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض صفات بعض انبیاء کی تخلیق میں بطور خاص شامل فرمادیں۔ اور وہی صفات ان کے اسم ٹھہرے۔ مثلاً حضرت ابراہیم ''حلیم'' ہیں۔ حضرت نوح ''شکور'' حضرت موسیٰ ''قوی وکریم'' اور حضرت اسماعیل ''صادق الوعد'' ہیں(علیہم السلام) قرآن حکیم اس کی تصدیق فرماتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انبیائے کرام کے سردار ہیں۔ آپؐ کے اسمائے مبارکہ معلوم ومعروف ہیں۔ ایک بزرگ نے تو اللہ کے ہر نام کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایک نام کا رشتہ اورنسبت متعین کی ہے۔ ان کا یہ رسالہ ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی مدظلہ نے اپنی کتاب ''زادِ راہ'' میں نقل کردیا ہے اور چند ناموں کے رشتہ کی وضاحت بھی کردی ہے۔ اس فقیر نے اس کام کو آگے بڑھایا ہے اور اب تکمیل مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اعزازِعظیم یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض اسمائے حسنیٰ کی نسبت اپنے محبوب ومحبّ کی طرف بھی کردی ہے۔ قرآن حکیم نے آپ کو ''بالمومنین رئوف الرحیم'' قرار دیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ''نور'' ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو بجز بشریت اپنی تمام صفات وکمالات اور اخلاق سے متصف فرمادیا تھا۔ یہی اللہ کا رنگ ہے۔ یہی اللہ کا اخلاق ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر

رنگ اور کیا ہوسکتا ہے۔

ان صفاتی ناموں کے علاوہ آقائے نامدار' سرورکائنات' فخر عالم وآدم حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض خطابیہ نام ہیں۔ ایسے نام جن سے اللہ اور اس کے رسول کے رشتوں کی دنیائیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ان دنیاؤں میں آدمی اپنے ظرف اور منصب وقوت کے مطابق سفر کرسکتا ہے۔ وہ مزمل ہیں اور مدثر ہیں۔ وہی یٰسین ہیں اور وہی طٰہٰ' سراج منیر' نذیر' مبشر' شاہد' شہید' یہ سب ان کے مقامات ہیں۔

جناب لطیف آثر نے ان ناموں کو پڑھا' سمجھا ان کو اپنی روح میں اتارا۔ ان کے فیض سے اپنی زندگی کو منور اور معطر بنایا۔ ان کو واسطہ بنا کر اپنے رب سے دعائیں کیں اور انہیں ناموں سے اس کو پکارا جسے یہ سب نام عطا کئے گئے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جب یہ نام ان کی فکر بن گئے اور دل کی دھڑکن تونعت کے قالب اور پیکر میں ڈھل گئے۔ ہر نام کے معنوی پہلو جیسے الفاظ کے ساتھ خودبخود ابھر آئے ہیں۔ اورشاعر کو جیسے کوئی شعوری کوشش نہیں کرنی پڑی' جو کوئی چیز' کوئی خیال' کوئی نام' کوئی بات' کوئی عقیدہ' ذات کا حصہ بن جائے تو یہی کرشمہ وجود میں آتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو جماعت مومنین کے لئے خیالوں کا خیال' ناموں کا نام اور عقیدہ ہیں۔ بعض اشعار دیکھئے:

آپ ہی کے لئے جو سچ پوچھو
عالم رنگ و بو بنا عاقب

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخرالزماں ہیں اور اس اعتبار سے آپ کا ایک اسم گرامی عاقب ہے۔ آپ کی تخلیق موجودات میں سب سے پہلے فرمائی گئی اور سب سے آخر میں تشریف لائے' گویا یہ بزم جہاں آپ کے لئے آراستہ کی گئی تھی۔ اس شعر میں یہی مفہوم کس حسن اور سچائی سے پیش کیا گیا ہے۔

راز وحدانیت کے کھولے ہیں
آپؐ کی ذات ہے بڑی فاتح

فاتح اس کا نام ہے جس نے کائنات کے تمام اسرار ورموز وا کردیے۔ دوسرے مصرعے کو دو طرح سے پڑھا جاتا ہے۔ ''بڑی فاتح'' بلاوقف کئے پڑھئے تو تخاطب ''آپ'' سے ہوگا۔ بڑی کے بعد وقفہ دے کر پڑھئے تو خطاب فاتح سے ہوگا۔ اور ''آپؐ'' کی ذات ہے بڑی کا ٹکڑا ایک اضافہ بن جائے گا۔

اس مجموعہ صحیفۂ نعت میں ایسے کتنے ہی مقامات ہیں جو پڑھنے والوں کو گہری روحانی مسرت عطا کریں گے اور یہ اشعار حقیقتہً درود وسلام کے حکم میں شامل ہیں۔ اللہ آثر صاحب کوصحت اور زندگی عطا فرمائے تا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

(صحیفہ نعت/لطیف اثر، ۱۹۸۹ء، کانپور اکیڈمی، کراچی)

جادۂ رحمت کا مسافر

غریب خانے میں ثنائے خواجہ کی ایک بزم مرتب کی گئی تھی ثناء خوانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نعتیں پڑھ رہے تھے اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دیارِ رحمت کے شہری جادۂ رحمت پر سفر کرر ہے ہیں۔ قیام وسفر کی یہ یک جائی ان کے ذکر کا فیض ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی زمان ومکاں پر یوں ہی تصرف فرماتا ہے۔

نہ ہے زماں نہ مکاں لاالہ الا اللہ

اور جہاں وہ ہوگا جس کے سوا کوئی الہ نہیں تو اس کے رسولؐ کا نام اس کے ذکر کا آہنگ بن جاتا ہے۔

اس بزم میں ایک آشنا اجنبی تھا۔ یہ دنیااور یہ زندگی بھی عجیب معمہ ہے یہاں ہم جن کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں' کام کرتے ہیں ان کے متعلق اچانک یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان کچھ بھی تو مشترک نہیں اور اقبال کا یہ مصرع ہمارا احوال بن جاتا ہے۔

چہ معصومانہ غربت راہ فریبم

اور یوں بھی ہوتا ہے کہ دیارِ رحمت میں جادۂ رحمت پر قطع مسافت کرتے ہوئے وہ مل جاتے ہیں جن سے ہمارا ظاہر اور باطن کچھ بھی چھپا نہیں رہتا۔ ہر نظارہ منظرِ شفاف بن جاتا ہے۔ اِدھر سے اُدھر کا پہلو صاف نظر آتا ہے ایسے لوگ کبھی کسی سہ پہر کو عرفات میں مل جاتے ہیں' کبھی مسجد الحرام میں آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی مواجہ

شریف میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی کے ہونٹوں سے درود کے ادا ہونے والے کلمے اور صیغے آپ کے لبوں سے ادا ہو رہے ہیں اور کبھی لحۂ نور میں وہ آپ کے کمرے میں روشنی بدست خود ہی آ جاتے ہیں یہ لوگ دلوں کے الاؤ کو روشن رکھنے والا ایندھن بھی ہوتے ہیں۔ نوائے سینہ تاب بھی اور آپ کے وہ بھائی جن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ''انما المومنون اخوۃ'' اور جب اس محفل میں اس آشنا اجنبی نے نعت خوانی شروع کردی تو محسوس ہوا کہ فضا کچھ اور روشن ہوگئی ہے خوشبو کی لہریں تیز تر ہوگئی ہیں اس کی آوازصحنِ قلب میں کھلے ہوئے گلہائے محبتِ احمدؐ و محمودؐ پر شبنم کی طرح برسنے لگی۔

کوئی مثلِ مصطفیٰ کا کبھی تھا' نہ ہے نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رتبہ کبھی تھا' نہ ہے نہ ہوگا

اس محفل میں حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہ بھی موجود تھے مولانا کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے ستارے ان کے دل کی کہانی کہہ رہے تھے مگر ان کے ہونٹوں سے جو تحسینی کلمہ کبھی کبھی ادا ہوتا وہ تھا ''بہت ٹھیک'' اس آشنا اجنبی کی نعت کے ہر مصرعے پر ''بہت ٹھیک''...... ''بالکل ٹھیک'' میں بدل گیا ......اور یہ کلمہ تحسین بھی فضا کا حصہ بن گیا۔ یہ کلمہ گم گشتگی اور اپنے آپ سے دوری کے لمحہ میں بھی تقاضائے شریعت کی پاس داری کا اعلان تھا۔

''تھا'' ''ہے'' ''ہوگا'' ماضی' حال اور یوم الدین تک پھیلا ہوا'مستقبل' اوراس کے بعد وہ حال ہے' جو خلود اور ہمیشگی کا نام ہے ...... وہ لمحہ ہمیشگی جسے جنت کہتے ہیں۔

ایک شعر کے بعد دوسرا شعر...... یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ نعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ذکر کی ایک سیڑھی ہے ......ایک زینہ ...... اور ہم قدم قدم اوپر جا رہے ہیں' ساعت کے وسیلے سے ہمارے مراتب بلند ہو رہے ہیں ......'رفع الاقدام' سے ''رفع المراتب'' تک:

مرے طاقِ جاں میں نسبت کے چراغ جل رہے ہیں
مجھے خوفِ تیرگی کا کبھی تھا نہ ہے' نہ ہوگا
سرِ حشر ان کی رحمت کا صبیح میں ہوں طالب
مجھے کچھ عمل کا دعویٰ کبھی تھا' نہ ہے' نہ ہوگا

نعت ختم ہوئی ......سب لوگ کچھ دیر خاموش رہے۔ یہ خاموشی حقیقی داد تھی مقطع سے شاعر کا تخلص تو معلوم ہوگیا ......کچھ دیر کے بعد

''میاں یہ کس کی نعت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ہی ہے۔'' شرماتے ہوئے نعت گو نے جواب دیا۔

''آپ کا پورا نام؟''

''صبیح رحمانی۔''

''تم اتنے کم عمر ہو تو خیال ہوا کسی اور کی نعت ہے۔''

''حضرت میں انتیس سال کا ہوں۔''

میں نے ایک بار پھر صبیح رحمانی کو غور سے دیکھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا نظر آنے والا یہ نوجوان اپنے آپ کو انتیس سال کا کہہ رہا ہے۔ جب تیرگی کا خوف نہ ہو تو وقت ٹھہر ہی جاتا ہوگا۔ معمولی سے خدوخال کتنے غیر معمولی نظر آنے لگتے ہیں۔ کہیں دور اس نوجوان کے وجود کی گہرائیوں میں نسبت کے جو چراغ روشن ہیں ان کی چھوٹ اس کے خارجی وجود پر بھی پڑ رہی ہے ......سارا منظر نامہ روشن ہے ......مگر اس حسن تک رسائی کے لئے بصارت کے ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔

یہ تھا ''جادہ رحمت'' کے شاعر صبیح رحمانی سے میرا تعارف۔ پھر صبیح رحمانی کبھی کبھی میرے پاس آنے لگے۔ نہ کوئی غرض ان کی مجھ سے وابستہ تھی' نہ میری کوئی غرض ان سے وابستہ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی میرے اور ان کے درمیان ایک پل بن

گیا تھا' جس طرح یہ اسمِ پاک ایک مسلم معاشرے کو دوسرے مسلم معاشرے سے جوڑتا ہے اور جوڑتا رہے گا...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف اللہ سے واصل ہیں اور دوسری طرف مخلوق میں شامل ہیں۔ یہ بات یہیں تک محدود نہیں۔ وہ مسلم معاشرے کی اساس اوراس کے اجزا کے درمیان وسیلہ وصل ہیں اور ہر فرد سے ان کا رشتہ قائم ہے۔

صبیح رحمانی دوسروں سے اپنے رشتہ میں اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قوتِ جاذبہ اور ملّت کو پیوستہ رکھنے والی طاقت ہیں اور یہ سطریں لکھتے ہوئے خیال آیا کہ ہم سب شجرِ محمدیؐ کے برگ وبار ہیں اور سی شجر سے وابستگی ہمارے قیام اور بقا کی تدبیر ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

صبیح رحمانی مجموعہ ہیں ایک سوچتے ہوئے ذہن' ایک دھڑکتے ہوئے دل' دوسروں کے ساتھ وابستگی کے ایک احساس کا...... اور یہ وابستگی اپنے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کا ثمرہ ہے۔ ان کی نعت گوئی ان کی ذات کا عکس ان کی شخصیت کی آواز' دل کی دھڑکن اور ذہن کی فکر ہے۔

مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے

''اے اہلِ ایمان ! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔''

یوں اسلام ذات کی سالمیت کے ساتھ اس پیغام کو قبول اور اختیار کرنے کا نام ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے لے کر اس دنیا میں تشریف لائے۔ مجھے نعت گوئی بھی قبولِ اسلام کی طرح ذات کی سالمیت کے ساتھ حقیقت محمدیؐ کو تسلیم کرنے کے مثل معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کچھ اختیار کرنے او رکچھ چھوڑدینے کا سوال ہے بعض صاحبان کے ہاں نعت گوئی کی یہ کلیت نظر نہیں آتی۔ لیکن آج کے بیشتر قابلِ ذکر نعت گو حضرات کے ہاں ان کی ذات کی سالمیت کا جلوہ نظر آتا ہے۔

الحمدللہ صبیح رحمانی ایسے ہی شاعروں میں شامل ہیں ان کی نعت گوئی کا رشتہ محسن کاکوروی' امیر مینائیؔ' حالیؔ' اقبال اور ظفرعلی خان کے وسیلے سے حضرتِ حسان بن ثابتؓ کی روایت ثنائے خواجہ سے قائم ہے۔

یہ نعت گوئی کے آداب اور شرائط کے بیان کا موقع نہیں لیکن ایک اہم سوال پر غور کئے بغیر ہم کسی نعت گو شاعر کا مطالعہ نہیں کرسکتے اس سوال کا تعلق نعت گوئی کی تنقید اور ادب میں اس کی زمرہ بندی سے بھی ہے۔کیا نعت گوئی کا رشتہ صرف ہمارے جذبۂ عقیدت سے ہے یا نعت' ایک ادبی صنف بھی ہے اور اگر یہ ادبی صنف ہے تو اس کی شرائط اور تقاضے کیا ہیں اور نعت گو شاعر کو شاعری کی تاریخ میں جگہ ملے گی یا محض اسے ایک گوشہ یعنی نعت کا شاعر قرار دیا جائے گا۔

''تاریخ ادب میں میرا کیا مقام ہوگا؟'' میرا خیال ہے کہ کسی حقیقی شاعر' افسانہ نگاراور تخلیقی فن کار کا سرے سے یہ مسئلہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو اپنے اظہار پر مجبور ہے بلکہ اسے اس پر مامور کیا گیا ہے' اسی طرح جس طرح درخت پر پتے نکلتے ہیں اور جس طرح کوئل کے سینے سے کوکوکی نوائے سینہ تاب ابھرتی ہے ......لیکن یہ مسئلہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے کہ کوئی صنف اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہے یانہیں اور وہ حیثیت کتنی اہم ہے۔ اگر نعت گو شعراء اس مسئلے سے الجھتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ ایک دن صبیح رحمانی نے مجھ سے یہ سوال کیا تھااور اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ گہرے تنقیدی شعور کے مالک ہیں۔

مذہبی خیال اور جذبہ کو شعر کا قالب عطا کرنا ایک مشکل بلکہ جاں کاہ مرحلہ ہے۔ اس کے لئے کسی حالیؔ' کسی اقبال کی ضرورت پڑتی ہے کسی بھی ادب اور زبان کو لیجئے مذہب کو شعر اور ادب میں ڈھالنے والے سوائے فارسی کے' بہت کم نظر آئیں گے' بات یہ ہے کہ مذہبی تصورات کو اپنا احوال بنانا' اسے اپنا وظیفہ قلب بنانا اور اپنی فکر کے درجہ تک پہنچانا معجزہ نہیں تو کرشمہ ضرور ہے ہمارے دور میں اردو زبان اور شاعری میں یہ کرشمہ رونما

ہو رہا ہے۔ ایسا کرشمہ جس کی سرحد معجزہ سے جاملتی ہے اور میری ناچیز رائے میں یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ بعد وفات ہے...... آج کی نعت میں اردو شاعری کی زبان اس کے کنائے' اعلامات اور رموز ایک نئی تخلیقی سطح پر ابھرتے بلکہ وجودِ نو پاتے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ محدود سے لامحدود کی طرف شاعر کا سفر نعت کے حوالے سے جاری ہے۔ یہ نکتہ میں خاصی تفصیل سے اپنی تحریروں میں پیش کر چکا ہوں اور یہ فن کی وہ منزل ہے جسے معراجِ سفر کہئے۔ جب ادب کا راستہ جادۂ رحمت بن جائے تو ادب کی کنجی سے دنیا میں اظہار کے ان مراحل کے قفل کھلتے ہیں جو روح کی وادیوں میں تمنا کے دوسرے قدم کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں ''ادب'' کا لفظ اپنے ہر مفہوم میں ادا کیا گیا ہے۔

صبیح رحمانی بھی اس جادۂ پر اپنے سفر کا آغاز کر چکے ہیں۔ ان میں نشاطِ تخیل بھی ہے اور ذہن کی وہ وسعت بھی جو ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ نشاطِ تخیل کی ترکیب قلم نے کاغذ پر لکھ دی' اور پھر اس ترکیب کو کاغذ پر دیکھ کر غالبؔ کا شعر یاد آیا۔

ہوں گرمئی نشاطِ تخیل سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں

غالبؔ نے جس جس طرح سے نعت کے پھول کھلائے ہیں وہ میرے ذہن میں نغمہ اور نظارے کی صورت میں موجود ہیں اور آج یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ یہ گلشنِ ناآفریدہ' نعت کے وسیلے سے آفریدہ بن سکا۔

صبیح رحمانی نے اپنے سفر کے آغاز ہی میں اپنے نقوشِ قلم اور نقوشِ قدم سے اپنی آمد کا اعلان کر دیا ہے اور نعت کی دنیا میں نقوشِ قلم اور نقوشِ قدم توفیقِ ازلی کا دوسرا نام ہیں۔ اس پر شاعر داد سے زیادہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

صبیح کے مختصر سے مجموعے میں ہائیکو بھی ہیں' آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ پابند' نظمیں بھی ہیں اور غزل کی ہیئت میں زیادہ نعتیں ہیں حقیقی نعت گو شاعر کے ہاں ہیئت

اور اصناف کا یہ تنوع' اپنے موضوع سے اس کے رشتے کی گہرائی اور تنوع دونوں کا اظہار ہے۔

نعت کے لئے ہمارے شاعروں نے غزل کے پیکر کو زیادہ استعمال کیا ہے اس سے آج کے نعت گو کے لئے آسانیاں کم پیدا ہوئی ہیں اور امتحان کی شکلیں زیادہ۔ صبیح رحمانی کے جذبۂ عشق کی شدت نے نئی زمینیں تراشی ہیں۔ اس نے طویل ردیفوں کو نئی معنویت دی ہے اور ان ردیفوں سے ربط اور تسلسل بھی پیدا ہوا ہے یوں اس کی بیشتر غزلیہ نعتیں' مکمل تجربہ بن گئی ہیں۔ یہ الگ الگ شعروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک وحدت اور اکائی ہیں۔ اس کی بہت سی نعتوں کی ردیفیں زیادہ طویل نہیں لیکن لسانی طور پر ایسی ہیں کہ ایک ربط پیدا کرتی جاتی ہیں۔

تھے عالی مرتبہ سب انبیاء اول سے آخر تک
مگر سرکارؐ سا کوئی نہ تھا اول سے آخر تک

مٹا دل سے غمِ زادِ سفر آہستہ آہستہ
تصور میں چلا طیبہ نگر آہستہ آہستہ

ختم ہونے ہی کو ہے دربدری کا موسم
جلد دیکھوں گا میں شہرِ نبویؐ کا موسم

مثالیں کہاں تک نقل کروں۔ آپ اس مجموعہ میں کئی ایسی نعتوں کا مطالعہ فرمائیں گے جو میرے قول کی صداقت کا آئینہ ہیں یعنی یہ نعتیں ایک وحدت اور اکائی ہیں۔ ویسے یہ سب اکائیاں ایک بڑی اکائی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ وہ اکائی جسے حبِ نبیؐ کہئے یا شہر نبویؐ کا موسم۔ نعت کے طفیل نعت گو شاعر اپنے لمحات سدا ایک روشن خرد افروز اور جذبِ دروں سے عبارت موسم میں گزارتا ہے۔

صبیح رحمانی کی غزلیہ نعتوں پر تبصرے کے بعد اس کی نظمیہ (پابند و آزاد) حمد و نعت

کے بارے میں کچھ اشارے میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کرچکا ہوں کہ اردو میں اچھی حمدیں نسبتاً کم ملتی ہیں وہ جس کا کوئی سراپا نہیں' وہ جس کا کوئی چہرہ نہیں اور پھر بھی جو ہر چہرے اور سراپے میں اپنے نقوش ثبت کردیتا ہے' اسے اپنے احاطے ادراک اور دائرہ محسوسات میں لانا بڑے تخیل اور کمال بندگی کے بغیر ممکن نہیں اور اس کے لئے وہ مرحلہ احساس بھی لازم ہے جب پہاڑ' دریا' سمندر سب اس کی تحریروں کی طرح اور سارے چہرے اس کے نقوشِ موقلم کی طرح نظر آئیں۔ اس مرحلہ احساس تک آدمی اللہ کے اسمائے حسنیٰ کی مدد سے پہنچ سکتا ہے۔ ''باری' خالق' اور بدیع'' ایسے اشاروں سے حیات وکائنات کی تخلیق کے زاویے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ ''رحمٰن' رحیم' وہاب' جبار' قہار' غفار اور عزیز'' سے انسانوں اور مخلوقات کے ساتھ اس کے رشتہ کے رموز تک پہنچا جاسکتا ہے اور وہ بھی کسی حد تک۔

صبیح رحمانی نے اس منزل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کردیا ہے اور اس کے قدم جادۂ معرفت پر مستقیم ہیں۔

وہ جس نے موجوں کو تشنہ اندازیاں سکھا کر
رقم چٹانوں پر راز ہائے ہنر کیے ہیں
وہ جس کی مدحت میں حرف آواز گنگنائیں
خموشیاں جس کے گیت گائیں

(پہچان)

خوش قسمت ہے شاعر کہ وہ آفاق کے حوالے سے خالق تک سفر کررہا ہے۔
وہ خالق جو ہماری شہ رگ سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔

صبیح رحمانی نے حمدیہ ہائیکو بھی لکھے ہیں۔ اردو زبان میں ہائیکو کے فروغ میں راقم الحروف نے بھی حصہ لیا ہے اور ہائیکو مشاعرے کی داغ بیل ڈالی ہے۔ کیا ہائیکو اردو کی

صنف سخن بن چکا ہے؟ شاید اس سوال کا جواب قبل از وقت ہے لیکن یہ بات یقیناً اہمیت رکھتی ہے حمد گو اور نعت گو شعراء نے ہائیکو' واکا' دوہا' سانیٹ جیسی اصناف میں بھی ثنائے رب اور نعت خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ اور خوشبوئیں بکھیری ہیں۔

صبیح رحمانی نے نظم پابند' نظم معریٰ وآزاد میں اپنے نبی اور رسول (علیہ السلام والصلوٰۃ) کی ذاتِ عالیہ اور اسمِ گرامی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں اضطراب اور سکون کی عجب آمیزش ملتی ہے۔ اضطراب آقائے ہر دو جہاں کو سمجھنے' جاننے اوران سے محبت کرنے کی کوشش سے عبارت ہے اور سکون ان سے وابستگی کے حصول کے احساس کا دوسرا نام ہے۔ اس احساس سے کس اُمتی کو قرار حاصل نہیں ہوگا کہ ہماری لوحِ جاں پر جو نقش لکھا نظر آتا ہے وہ انہی کا نام ہے۔ سلام ان پر' درود ان پر۔

صبیح رحمانی ابھی جوان ہیں اور اس دنیا کی لذتیں تو پیرِ ہزار سالہ کے جسم میں بھی کم سے کم ارتعاشِ لذت پیدا کردیتی ہیں۔ یہ ان کی سعادت ازلی ہے کہ ان کی ذات کے ایوانوں میں شہ لولاک کے نام سے ہر طرف جگ مگ جگ مگ ہو رہی ہے' جس نام کی برکت سے باغِ جنت کے پھول کھلتے ہیں وہی نام ان کے ہونٹوں پر خوشبو کے دائرے بنا رہا ہے۔ اورسب سے بڑی بات یہ کہ شاعر نے اس نام کو اپنے لئے اسمِ اعظم بنالیا ہے۔

ہے یہی نام تو میری شبِ یلدا کی سحر
جسم وجاں میں جو چراغاں ہے اسی نام کا ہے
بس اسی نام کی خوشبو ہے میرے ہونٹوں پر
بس یہی نام دو عالم میں بڑے کام کا ہے

اور یہی نام ''جادۂ رحمت'' ہے۔ جادۂ رحمت ہمارے لئے' ہمارے بزرگوں کے لئے' ہمارے بعد آنے والوں کے لئے اور صبیح رحمانی کے لئے ......اور اس جادۂ رحمت پر

چلتے ہوئے صبیح رحمانی کے ذوقِ نغمہ نے لفظوں سے روحانی سمفنی تخلیق کرنے کا فن سیکھنا شروع کر دیا ہے اور اس کے ذہن میں نئی ترکیبوں کے قافلے اترنے لگے ہیں۔

مٹ جاتے ہیں غم
رحلِ لب پر آتا ہے
جب اسمِ اعظم

خدا کرے یہ سفر جاری رہے۔ یہ نغمے روح اور دل سے صفحہ کاغذ تک اپنا سفر جاری رکھیں کہ یہی مقصودِ فن اور حاصلِ زیست ہے۔ ان سطروں کا مقصد صبیح رحمانی کے حروف کے توسط سے اپنے شفیع' اپنے نبیؐ اپنے ہادی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں شرکت کے سوا کچھ اور نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی آدمی کے مرتبوں کو بلند کرتی ہے۔ ان کے لئے مقامِ محمود کی دعا ہمارے لئے اس بلندی سے قربت کا سبب بنے گی کیونکہ مقام محمود تو انؐ کے رب کی طرف سے ان کے لئے ہے یہ دعا تو ہمارے لئے ترفع کا ایک وسیلہ ہے۔

(جادۂ رحمت/صبیح رحمانی، ۱۹۹۳ء، ممتاز پبلشرز، کراچی)

نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

آغازِ کلام اس خالقِ حرف ونوا کے نام سے جس نے انسان کو بیان عطا فرمایا اور اس بیان کی معراج حمد وثنا کی صورت میں عطا کی۔

جناب نثار احمد خاں صاحب فتحی ایک صاحبِ نسبت صوفی ہیں۔ ان کے شب وروز اس مجاہدے میں بسر ہوئے ہیں جو انسان کو مرتبہ وصول تک پہنچا دیتا ہے۔ اور اس بندہ فقیر کی دعا ہے کہ وہ حقیقت سے پیوستہ ہو کر فنائے ذات کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے واصل بالحق ہو جائیں۔

ہمارے صوفیائے عظام کی روایت شعرو ادب بھی ہے۔ وہ اشارات وکنایات کی مدد سے اپنے وابستگان دامن کو تجلیات کا مشاہدہ کراتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جناب نثار احمد خاں صاحب کے پہلے مجموعہ کلام ''حسرتِ نایافت'' پر لکھتے ہوئے راقم الحروف ان کے معاملات اور اسلوبِ شعر پر اپنے خیالات پیش کر چکا ہے۔

''نگاہے یارسول اللہ نگاہے'' پر چند سطریں لکھنے کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ اس تمنا اور دعا میں ہم بھی شامل ہو جائیں۔

یہ مجموعہ حمد' نعت' منقبت اور پندوموعظت کا گنجینہ ہے' بلکہ اسے گنجینہ اسرار کہئے۔ خاں صاحب قبلہ کا مقصد شاعری اور اس کے محاسن کی نمائش نہیں بلکہ اربابِ نظر کو مقاماتِ بلند سے روشناس کرانا بقول اقبال: نغمہ کجا و من کجا' سازِ سخن بہانہ ایست

وہ عملاً بھی اپنے شاگردوں کو مکتبِ مصطفیٰ تک پہنچانے کا وسیلہ اور ذریعہ بنے ہیں

اور اب اپنے پڑھنے والوں کو اسی در تک پہنچانا چاہتے ہیں‘ وہ در جہاں زندگی اور اس کے قرینے تقسیم کئے جاتے ہیں۔

جینا اک فن ہے اور یہ فن بھی
مکتبِ مصطفیٰ سے آتا ہے

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جناب نثار احمد خاں کی نوائے سینہ اب ان کے پڑھنے والوں کے قلوب کو روشنی اور گرمی کی دولت عطا کر سکے۔

(نگاہے یارسول اللہ نگاہے/ نثار احمد خان فتحی ،۱۹۹۴ء، امیج پرنٹر، کراچی)

دل کی شاعری

قمر وارثی صاحب اور راقم الحروف دونوں کراچی میں رہتے ہیں لیکن اس شہر میں ہم مشکل سے دو تین بار ملے ہیں۔ اس سے زیادہ ہماری ملاقاتیں اس شہر میں ہوئی ہیں جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

اے خنک شہرے کہ آں جا دلبراست

اور ان ملاقاتوں میں سے بیشتر ملاقاتیں باب السلام کی سمت ہوئی ہیں‘ جب وہاں سے گنبدِ خضریٰ خوب نظر آتا تھا اور ہماری آنکھیں اس کے عکس نور سے منور ہوتی تھیں۔

قمر صاحب حد درجہ مودّب نظر آئے۔ اس کوچے میں مومن کا وجود ہی غبار بن جاتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں اکثر انہوں نے ان صاحبوں کی مدینہ میں بلکہ مسجد نبوی (علیٰ صاحبان الف الف سلاماً) میں موجودگی کی خبر دی جن سے میں واقف ہوں۔ یہ عمل بھی مسلمان کو مسلمان سے قریب تر لانے کا عمل ہے۔ شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جس کی موجودگی کی خبر سنائی دے‘ کیا سننے والے پر یہ لازم نہ ہوگا کہ اس کی حاضری کی قبولیت کی دعا نہ کرے۔

قمر وارثی صاحب کے لہجے میں انکسار اور آنکھوں میں شرافت ہے۔ ان دونوں کے مجموعے کو ادب کہہ لیجئے اور

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اسی ادب نے انہیں نعت گو بنادیا ہے کہ وہ بارگاہِ عالیہ پر ادب کا مرجع ہے۔ ہر

ادب ان کے در کی طرف لوٹ کر وقیع تر ہوجاتا ہے۔

ان کا پہلا نعتیہ مجموعہ شمس الضحیٰ آٹھ سال پہلے ربیع الاول ۱۴۰۷ھ میں شائع ہوا تھا اور شاید دوسرا مجموعہ کہف الوریٰ ۱۴۱۵ھ میں شائع ہوجاتا اگر تاخیر کے اسباب نہ ہوتے اور میں بھی اُن اسباب میں شامل نہ ہوتا۔

آیئے پہلے شمس الضحیٰ کے چند اشعار کا مطالعہ کریں۔ ان اشعار کے انتخاب میں ''نظر کے سامنے'' آجانے کی شرط کے علاوہ کوئی دوسری شرط عائد نہیں کی گئی ہے۔ شاعر کے مقامات کو تلاش کرنے کے طریقوں اور وسیلوں میں یہ طریقہ بھی شامل ہے۔

حضورؐ! منصب معراج زندگی کے لئے
بلا بھی لیجئے اب درپہ حاضری کے لئے

درِپاک پر سر جھکے اور نہ اٹھے
حیات اس قدر مختصر چاہتے ہیں

اتباع مصطفیٰ پر جو عمل پیرا رہا
اس نے ہر مشکل گھڑی اپنے لئے آسان کی

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ قمر وارثی کی نعتیہ شاعری دل کی شاعری ہے مگر اس میں فکر اور غور وتجزیہ بھی شامل ہے۔ پہلے دو شعر ان کے جذبات کی تصویریں ہیں اور تیسرا شعر مسلمان کی زندگی ہے۔ یہی وہ نسخہ ہے جو قرآن حکیم نے قربِ الٰہی کے لئے تجویز کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے والے سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں اور اس کے گناہوں کو معاف کردیتے ہیں۔ آپ کا در ہی وہ در ہے جہاں صاحب معراج کے حضور سلام کرنے کا موقع ملتا ہے' پس یہ حاضری خود معراج بن جاتی ہے بشرطیکہ آداب

حاضری کا حق عملاً ادا کیا جائے۔

شاعری کا مطالعہ میں ترتیب سے نہیں کرتا بلکہ صفحات کی ورق گردانی کرتے ہوئے مطالعے کی محنت کے حاصل کی تلاش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ ''نظر کے سامنے آنے'' کی بات آپ سے عرض کرچکا ہوں۔ یہ نکتہ بھی عجیب نکتہ ہے جیسے ہم کسی کی نگاہ میں آجاتے ہیں تو ہمارے زمین وآسمان بدل جاتے ہیں' اسی طرح کوئی شعر یا اشعار ہمارے سامنے آجائیں تو ان کی قسمت میں ہمارے تجربے میں شرکت مقدر ہوتی ہے یا وہ اشعار ہمارے لئے ایک نیا گوشۂ فکر یا زاویۂ خیال بن جاتے ہیں۔

''کہف الوریٰ'' کے مسودہ کو میں نے کھولا تو یہ شعر میرے سامنے آیا۔

اپنی منزل روز کرلیتا ہے آساں آفتاب
سبز گنبد کی سلامی پر ہے نازاں آفتاب

مجھے یقین ہے کہ قمر وارثی صاحب مجھے یہ شعر اپنے پھوپھی زاد بھائی محمد طلحہ جنیدی کی خدمت میں نذر کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ غالباً ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ عمرے کے بعد (ہم اکثر عمرہ انہیں کے ساتھ کرتے ہیں) ہم طلحہ سلمہٗ کے ساتھ مدینہ شریف گئے۔ رمضان کا مہینہ تھا اور اس وقت تک حرم کا درمیانی صحن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ درمیان میں سنہری جالیوں والے کٹہرے تھے اور وہاں بیٹھنے والے اور بیٹھنے والیاں گنبد خضریٰ کے نور سے آنکھوں کو منور کرتے تھے۔ طلحہ نے پہلے ہی دن کہا' بھائی جان اور بھابی! عصر کی نماز کے بعد اسی صحن میں بیٹھا کیجئے۔ تاکہ آپ گواہی دے سکیں کہ سورج گنبد خضریٰ کو کس طرح سلامی دینے کے بعد اپنے مستقر کا رخ کرتا ہے اور اس شام کے بعد سے آج تک سلامی کی گواہی کم سے کم میری قسمت میں ہے۔ مسلم خواتین اپنے رسول' اپنے آقا اور اپنے سب سے بڑے مرّبی سے مکانی طور پر دور تر کردی گئی ہیں مگر مسافت' دوری وقربت کی پیائش تو دل سے ہوتی ہے۔

لیجئے ایک اور صفحہ کھلتا ہے اور عجب بات ہے کہ اس مرتبہ بھی مطلع پر ہی نظر پڑتی ہے۔

رکھتا ہے کیف وراحت فکرونظر سے کام
یادِ نبیؐ میں جس نے لیا چشم تر سے کام

بات راحت وکیف تک محدود ہوتی تو یہ ہم جیسوں کا عام تجربہ ہوتا۔ راحت مدینہ طیبہ میں نہیں ملے گی تو کہاں ملے گی۔ کیف مواجہ شریف اور ریاض الجنتہ میں نصیب نہیں ہوگا تو کہاں نصیب ہوگا مگر یہاں تو معاملہ۔

جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

کا معاملہ ہے' دنیا کا کوئی گوشہ ہو' اس خاکداں کا کوئی حصہ ہو' یاد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے گلزار ہوجاتا ہے اور چمک اٹھتا ہے مگر اس شعر کا اصل نکتہ فکر ونظر وچشم تر کا امتزاج ہے۔ اُس موضوعِ حُبّ مومن' اس صاحب وحی (وحی' عرفان وفکرونظر رحمانی ہے) سے رشتہ فکرونظر اور چشم تر کوئی وحدت بنا دیتا ہے۔ میں نے یہ نکتہ اپنے کئی تنقیدی مضامین میں عرض کیا ہے کہ شاعر فکر کو دل کی دھڑکن میں اور جذبہ کو عقل وتفکر میں بدل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ عقل ودل ایک ہوجاتے ہیں' الفاظ اپنی اندرونی غنائیت سے رقص کرنے لگتے ہیں۔ اس مرحلے تک پہنچنے کا موقع نعت گوشاعر کو جس طرح مل سکتا ہے' دوسروں کے لئے مشکل ہے۔

''کہف الوریٰ'' پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی محترم حاضر باشوں کا قرض اس قلم کو ادا کرنا ہے۔ اس لئے اس تحریر کو سمیٹتا ہوں اور تحدیثِ نعت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ رات اپنے پایان تک پہنچ چکی ہے' اذان فجر ہونے والی ہے اس تحریر کو بھی درود سلام کے زمرے میں شامل کرتا ہوں لیکن یہ ساعت درودِ ابراہیمی کی ساعت ہے اور جناب قمر وارثی کے حق میں دعا کا ہنگام ہے اور نعت گو

کے لئے دعا دراصل اس کائنات اور اہل کائنات کے لئے دعا ہے۔

(کہف الوریٰ/ قمر وارثی،۱۹۹۵ء، دبستان وارثیہ کراچی)

ندائے نوری

مسرت جہاں نوری، بیگم شفیق بریلوی کا ادبی نام ہے۔ یہ دونوں زندگی کی راہوں پر ایک دوسرے کے ہم قدم تھے اور ادب کی دنیا میں ایک دوسرے کے رفیق...... ایسی مثالیں ہمارے ادب میں موجود تو ہیں مگر ذرا کم کم پھر اس درجہ ہم رنگی، ہم مذاقی اور ہم نظری بھی نایاب نہ سہی، کم یاب ضرور ہے......اور یہی وہ صفات ہیں جو مسلم معاشرے میں جنت کی جھلک پیدا کردیتی ہیں۔

مسرت بھابی نے اس مجموعہ شعر جو حمد، نعت اور منقبت سے عبارت ہے کے آغاز میں بڑی سادگی، بڑی سچائی اور دیانت سے اپنی ادبی زندگی کا حال قلم بند کردیا ہے۔ ننھیال اور ددھیال کی طرف سے انہیں حرف ونوا کی میراث ملی۔ اس میراث کو ان کی ذاتی کاوشوں نے فروغ دیا اور شفیق بریلوی مرحوم کی رفاقت نے اس ادبی رخ کو نمایاں تر کیا اور اس کو پڑھنے والوں تک پہنچنے میں مدد دی۔

شفیق مرحوم کی طویل ادبی زندگی میں ہمیں کئی دور ملتے ہیں۔ افسانہ نگاری، فلمی صحافت، خواتین کے حقوق کی پاسبانی اور آخر میں وہ دین اور اس کے حقائق کے اظہار اور ترجمانی کے لئے چُن لئے گئے۔ یہ شاید صرف ان کا انتخاب نہیں تھا بلکہ اس میں فیضانِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہے۔ شفیق مرحوم نے بہت لکھا مگر آج انہیں خاتونِ پاکستان کے رسولؐ نمبروں اور ارمغانِ نعت کے حوالے سے عام لوگ یاد رکھتے ہیں۔ انہوں نے اسلامی نظامِ حیات پر بھی ایک کتاب مرتب کی تھی جو افسوس کہ ان کی زندگی

میں شائع نہ ہوسکی۔

مسرت جہاں نوری نے اپنی ادبی زندگی مختصراً آپ کے لئے قلم بند کردی ہے، میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔ ہاں ان کی کتاب ''روح کا سفر'' کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔

یہ کتاب انہوں نے شفیق مرحوم کی وفات کے بعد اپنے شخصی اضطراب کو سکون سے ہمکنار کرنے کے لئے لکھی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلم خاتون ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ روح اللہ کا امر ہے۔ یہی امر رب انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے الگ کرتا ہے۔ روح مادہ سے آزاد اور بلند تر الوہیاتی توانائی ہے مگر ان کا اضطراب اتنا شدید تھا کہ وہ اس سوال سے الجھتی رہیں کہ حیات بعد الممات ہے کیا؟ حیات بعد الممات پر ان کا پختہ عقیدہ تھا مگر انہوں نے اپنے حوالے سے روح کے سفر کی کہانی قلم بند کی۔ اس کوشش میں قرآن حکیم احادیث او رمستند اسلامی ادب کو اپنے سامنے رکھا پھر اس مشکل موضوع پر نہایت آسانی کے ساتھ کام کی باتیں تخلیقی انداز میں لکھ دیں۔ روح کا سفر ایک تخلیقی کتاب ہے جس میں معلومات وحقائق کو ذاتی کاوش وتلاش کے بعد پیش کیا گیا ہے۔

''ندائے نوری''......روح کا سفر کی ایک توسیعی صورت ہے کیونکہ روح نور ہی نور ہے اور غیر مادی ہے اور اس کی ترجمانی اور تفہیم کے لئے نورِ مطلق کے ادراک کے ساتھ ساتھ اس ذات سے قربت بھی لازم ہے جو امرِ ربی کا ترجمان تھا۔صلی اللہ علیہ وسلم حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی شاعری کے لئے برادر محترم حضرت سرشار صدیقی نے ایک اچھی اصطلاح ایجاد کی ہے۔''شعرِ عقیدت'' ندائے نوری بھی شعر عقیدت کا مجموعہ ہے۔ اس میں نعت کو اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

نعت گوئی ایک معنوی اور روحانی صنف سخن ہے۔ ایسی صنف جس کے لئے کسی ہیت اور شاعرانہ فارم (Form) کی قید نہیں۔ نعت قصیدہ، مثنوی، مسدس، رباعی کسی بھی پیکر میں پیش کی جاسکتی ہے۔ سرکار دو عالم کی محبت ہر قالب کو اپنا قالب بنالیتی ہے اور

سبوئے جاں میں جھلکتی ہے کیمیا کی طرح
کوئی شراب نہیں عشقِ مصطفیٰ کی طرح

(سراج الدین ظفر)

یوں نعت گوئی صنف سخن تو ہے ہی، مگر اس کو پرکھنے، پسند کرنے اور اس کی قدر کے تعین کے معیار خالص ادبی نہیں۔ یہ معاملات ماورائے ادب ہیں۔ ایک سخن فہم، اہلِ قلم اور صاحب دل خاتون نے سچ کہا ہے کہ نعت صنف سخن ہی نہیں، توفیق الٰہی بھی ہے۔

عرفی نے سچ کہا تھا کہ یہ راہ (نعت گوئی) تلوار کی دھار پر قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ ایک طرف احتیاط ایسی کہ سانس لینے میں لڑکھڑا جائے کیونکہ ذکر اس کا ہے کہ جس کی ادب گاہ عرش سے نازک تر ہے اور جہاں جنید وبایزید بھی نفس گم کردہ حاضر ہوتے ہیں اور اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے زمان ومکاں کے کتنے ہی رنگوں اور منظروں کو دیکھتے ہیں۔

بیگم شفیق بریلوی کو احساس ہے کہ نعت گوئی ایک جراتِ بیکراں ہے لیکن سرکار ختم المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کنیز کے دامن خالی میں یہی دولت ہے۔ وہ لفظ جن میں دل کی دھڑکن اور آنسوؤں کی چمک ہے، سو وہ یہی کچھ نذرانے کے طور پر لے کر حاضر ہوئی ہے۔ مجموعہ کا انتساب اور سرنامہ یہی ہے۔

میں شاعر ہوں سرمایہ ہے شعر میرا
وہ نذرِ شہِ مرسلان کررہی ہوں
تہی دست ہوں، میرا دامن ہے خالی
مگر جرأتِ بے کراں کررہی ہوں

انساں اور یہ جرأت رندانہ کرے؟ کیسے ممکن ہے اگر کچھ ادھر کا اشارہ نہ ہو۔ نوری بریلوی کی نعت گوئی اسی اشارہ کی تکمیل فرمان ہے:

میں کروں ثنائے احمدؐ ہوا غیب سے اشارہ
نہ قلم میں تاب وطاقت نہ زبان کو ہے یارا

مسرت جہاں نوری کی نعت گوئی غیب کے اشارے کے تابع بھی ہے اور اپنے شوہر کی خواہش کی تکمیل کا وسیلہ بھی۔ یہ نعت جس کا مطلع میں نے اوپر نقل کیا ان کی پہلی نعت ہے جو ایک پوری رات کی بے چینی، اضطراب اور اذن طلبی کا نتیجہ ہے۔ اور پھر تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی عقیدت کا اظہار شعر کی زبان میں کرتی رہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور انشااللہ جاری رہے گا۔

چند اور شعر پیش کرتا ہوں جو ان کے مسودہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے نظر سے گزرے اور میرا خیال ہے کہ یہ شعر ان کے جذبۂ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نعت گوئی دونوں کی ترجمانی بطریقِ احسن کررہے ہیں۔

بے خودی ایسی کہ ہے خواب میں بھی لب پہ درود
جذب ایسا کہ مدینہ نظر آجاتا ہے

بے خودی اور جذب، خواب اور بیداری، یہ پوری زندگی کی علامتیں ہیں...... یوں یادِ سرکار اور نظارہ مدینہ، نوری کے شب وروز ہیں۔

ہوا محسوس ذہن وفکر پر اک نور کا سایہ
جب ان کی مدح میں، میں نے قلم اپنا اٹھایا ہے
بھٹک سکتے نہیں میرے قدم میدانِ ہستی میں
خدا کو اور حبیب پاک کو محور بنایا ہے

دوسرا شعر، یہی ایمان ہے، یہی اسلام اور یہی مومن کی زندگی ہے۔ اسلام نام ہے اپنے نفس کو اس کے تابع کرلینے کا جو سرکار دوعالم لائے اور جو ان پر نازل ہوا۔ اسی کا تذکرہ ہی حقیقی نعت ہے۔ سچی نعت کی پہچان یہ بھی ہے کہ وہ حضور کی سنت، ان کے

طریقے اور اسلوبِ حیات سے اپنے قاری کو قریب کردے۔

ندائے نوری میں بڑا تنوع ہے۔ کہیں غزل کے پیکر میں نعتیں ہیں' کہیں مسدس کے ذریعے اظہار ہے اور کہیں مخمس کے وسیلے سے ثنائے خواجہ پیش کی گئی ہے۔

کہیں چاند سے خطاب ہے تو کہیں ساری کائنات میں عشق محمدِی کے جلوہ کو دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک کے بڑے واقعات کو بھی موضوع قرار دے کر نعت کہی گئی ہے۔ مثلاً تذکرہ شبِ معراج یہ وہ عظیم واقعہ ہے کہ جس کے توسط سے اقبال اس صداقت پر پہنچے۔

خبر ملی ہے یہ معراج مصطفیؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

نوری ایک محبت بھرے قلب کی مالک مسلمان خاتون ہے۔ وہ معراج کی شب کا ذکر یوں کرتی ہے۔

سارے اسرار حق کے دکھائے گئے
سارے پردے دوئی کے اٹھائے گئے
راز دار حقیقت بنائے گئے
جاگو جاگو کہ معراج کی رات ہے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راز دار حقیقت تو پہلے ہی تھے لیکن اس بند کے پہلے دوسرے مصرعوں میں ''سارے'' کے لفظ نے کیسی معنویت پیدا کردی ہے اور ٹیپ کا مصرع

جاگو جاگو کہ معراج کی رات ہے

نبوت کی عظمتوں کا پیغام ہے آج کے مسلمان کے لئے۔ جاگتے رہنا نورحق کی پاس داری کرنا اور شافعِ روزِ جزا (باذن اللہ) سے اپنے رشتہ کو قائم رکھنا ہی اسلام اور

ایمان ہے۔

خدا کرے کہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں اور میلاد کی محفلوں میں قبولیت حاصل کرے اور ''ندائے نوری'' اہل ایمان کے قلوب کو گرماتی رہے۔

(ندائے نوری/مسرت جہاں نوری، ۱۹۹۵ء، مرکز علوم اسلامیہ، کراچی)

نعت نگر کا خوش نوا فقیر

آفتاب کریمی صاحب کو دیکھتے ہی فیض صاحب کا مصرع ذہن میں اپنے آپ دہرانے لگتا ہے۔

آیا ہمارے دیس میں، اک خوش نوا فقیر

فیض صاحب کا اور ہم سب کا وہ خوش نوا فقیر تو آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا۔

لیکن نعت نگر کا یہ خوش نوا فقیر تو ہمارے درمیان ہے، اور خدا کرے مدتوں ہمارے درمیان رہے۔ اس کے نغموں میں وفور بھی ہے اور وہ نرم روخروش بھی جو الفاظ کے شور کی جگہ روح کے اضطراب وسکون کی نشاندہی کرتا ہے۔ اضطراب سے پیدا ہونے والا خروش، نغمہ گر کو اور سننے والوں کو سکون کی دولت سے ہمکنار کرتا ہے۔

فقیر کے لفظ کے پیچھے معانی کے کتنے ہی رنگ، ماضی کی کتنی ہی روایات اور شعروسخن اور تصوف کی کتنی ہی حکایات موجود ہیں جو نظارے کی طرح دکھائی اور نغمے کی طرح سنائی دیتی ہیں۔ اہل تصوف کے نزدیک ''فقیر وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی کا محتاج نہ ہو۔'' بات اور آگے بڑھتی ہے۔ فقیر ہست کی نہیں بلکہ نیست کی منزل میں ہوتا ہے۔ یوں وہ اپنے وجود اور اپنی ہستی کو پیچھے چھوڑ کر منزل قربِ الٰہی کے جوار میں رہتا ہے اور جب ہستی ہی نہ رہی تو پھر احتیاج اور ضرورت کب باقی رہے گی۔ فقر فقیری اور فقیر کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھئے تو آتش کا شعر اپنے چہرے سے نقاب الٹ دے گا۔

منزل فقر وفنا جائے ادب ہے غافل
بادشاہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے

کریمی صاحب کا سفر اس منزل کی طرف جاری ہے۔ محفل میں انہیں بیٹھے دیکھئے تو باہمہ اور بے ہمہ کے معانی سمجھ میں آ جائیں گے۔

شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

ان سے کچھ بھی کہئے جواب ایک ہی ملے گا۔ ''بہت اچھا'' جھکی ہوئی گردن، اگر وہ جنبش نہ کر رہے ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ عجز وانکسار کی تصویر سامنے ہے یا مجسمہ کہہ لیجئے۔ بہت سے لوگ عجز کو اوپر سے اوڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں ان کا تکبر اور نمایاں ہوجاتا ہے۔

شاعری کے حوالے سے بھی ''فقیر'' ایک روایت ہے۔ ہندی شاعری اور ہندو کلچر میں بھاٹ ایک مستقل کردار تھا۔ عوامی شاعر اور نغمہ گر، کسی میلے اور تہوار کا رنگ اس کے بنا نہیں جمتا تھا۔ اس کے بول اس کے سماج اور اس سماج کی روح کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ معاشرے کی اجتماعی آواز ہوتا تھا۔ بنگلہ شعر وادب میں فقیر دھرتی سے شاعر کے ناتے اور بندھن کی علامت تھا۔ ٹیگور ہوں یا نذر الاسلام ان کی کویتا کی دھڑکن فقیروں کے وہ گیت اور بول ہیں جو ان کے بچپن کے سر پر آسمان کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اور فقیرانہ آواز، ندا اور پکار تو ہماری شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے۔ جب شاعری کے معانی، صدا کے ساتھ مل جائیں اور اس صدا سے ہماری زندگی کی ڈیوڑھیاں گونجنے لگیں تو زندگی گہرے روحانی تجربے سے آشنا ہوجاتی ہے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جب نغمہ اور شاعری، دعا بن جائے تو معاشرے میں ضبط پیدا ہوجاتا ہے۔

اس اعتبار سے بھی ہمارے کریمی صاحب فقیر ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری فقیرانہ صدا ہی تو ہے۔ ہمارے بچپن کی یادوں میں سے ایک یاد اس فقیر کی بھی ہے جو فجر کی نماز کے بعد آتا۔ کسی سے سوال نہ کرتا اور بس ایک ہی شعر کو اس نے اپنا اظہار بنالیا تھا۔

ایک دن عرش پہ محبوب کو بلواہی لیا
ہجر کا غم تو خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا

میں اس شعر اور اس کے مضمون سے ایک بار نہیں، ہزار بار برأت کا اعلان کرتا ہوں مگر یہ شعر ایک فقیرانہ صدا کی صورت، سدا کے لئے زندگی کا حصہ بن گیا ہے اور پھر ایسی بہت سی نعتیں، شعر اور مصرعے اس معاشرے کی فضا کا حصہ تھے۔

میں سوجاؤں یا مصطفٰی کہتے کہتے
میرا سلام لے جا
یثرب کے جانے والے
میرے مولا! بلالو مدینے مجھے
سرکارِ دو عالمؐ کی امت پہ ستم کیوں ہو

ان نغموں اور بولوں کا مقابلہ محسن کاکوروی، حالی، اقبال اور ظفر علی خاں کی شاعری اور مضامین سے نہ کیجئے۔ لیکن یہ بات تو مان لیجئے کہ ان بولوں میں اس معاشرے کے اندازِ فکر، بلکہ اندازِ محبت اور اسلوب اظہار کی بہت سی تہیں موجود ہیں۔ کسی حد تک مولانا احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری میں یہ اجتماعی آواز ملتی ہے اور جہاں تک ان کے سلام کا تعلق ہے وہ اعلیٰ شاعری، انفرادی جذبہ اور اجتماعی فضا کے تمام عناصر کا مجموعہ ہے۔

مصطفٰیؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

اس پس منظر میں ''آنکھ بنی کشکول'' کے حمدیہ نغمے اور نعتیں آپ کو اس ماضی میں لے جائیں گی جب مذہب میں سماجی زندگی، مجلسوں اور تہواروں کے سارے رنگ اور

آوازیں موجود تھیں۔ کریمی صاحب کی آواز میں وہ سب نغمے اور آوازیں موجود ہیں اور یوں یہ ایک منفرد مجموعہ ہے۔ اس میں میلوں ٹھیلوں کے آہنگ کے ساتھ سماع کی محفلوں کی فضا موجود ہے۔ وہ فضا جو تکرار لفظی سے پیدا ہوتی تھی۔ کسی ایک لفظ سے فضا میں تاثر کے دائرے پھیلتے چلے جاتے۔

آمد خیرالوریٰ کی دھوم ہے ہاں دھوم ہے
ہر طرف صلِ علیٰ کی دھوم ہے ہاں دھوم ہے

''دھوم ہے ہاں دھوم ہے ......'' یوں لگتا ہے جیسے دھمال ڈالا جارہا ہو۔ جسمانی دھمال نہیں، صوتی دھمال اور پھر ''ہاں'' کی طاقت کو دیکھئے۔ میں حتی المقدور اپنے آپ کو دین کے دائرے میں رکھتا ہوں، بدعت سے گریز کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ جانتا ہوں کہ یہ شاعری، یہ آہنگ بدعت نہیں بلکہ ایک معاشرے کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک جز کا نام ہے۔

کریمی صاحب کی ایسی شاعری لوک کلا، لوک کویتا اور لوک ادب کی شان رکھتی ہے۔ لوک ادب کا مصنف بے نام ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں شاعر کا نام معلوم ہے، مگر کون جانے کہ ان سب آوازوں نے اور ہمارے ماضی نے کریمی صاحب کو اپنے لئے چن لیا ہو اور ذرا دیکھئے تو جسم پر فقیری لباس پہنے ہوئے، آنکھوں میں آنسو اور ہاتھ میں لفظوں کا کشکول لئے (وہ کشکول جس کے چاروں طرف رنگ برنگے موتی لگے ہیں اور جس کی بناوٹ کشتی کی طرح ہے) کریمی صاحب ہمارے نئے اور اجنبی معاشرے کی گلیوں میں آواز لگاتے ہوئے گھوم رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر وہ بھولے ہوئے لفظ یاد آگئے۔ ''گاتا جائے بنجارا'' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بنجارے کے لبوں سے یہ نغمہ ابھر رہا ہے۔

جب بند دلوں کی دھڑکن ہو
ہاتھوں میں نبیؐ کا دامن ہو
جو عشق نبیؐ سے روشن ہو

وہ شمع جلانے آیا ہوں
میلاد سجانے آیا ہوں
میں نعت سنانے آیا ہوں

یہ ''میلاد'' کہاں ہو رہا ہے؟ کون کررہا ہے یہ میلاد؟ بات یوں تو نہیں کہ کریمی صاحب ہمارے اور آپ کے شب وروز کو میلاد کہہ رہے ہوں اور وہ ہماری زندگیوں کو اپنی آواز سے روشن کرنے کے لئے ہمارے درمیان آ گئے ہوں۔

کریمی صاحب کے ہاں گیت اور ہندی شاعری کی ایک اور روایت بھی ملتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اظہار محبت عورت کی طرف سے کیا جاتا ہے اور شاعر اپنے لئے صیغہ تانیث استعمال کرتا ہے۔ یہ اسلوب بعض اور شعراء کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ یہ روایت ریختی کی روایت سے بالکل مختلف ہے' اگر کوئی بات مشترک ہے تو صیغہ تانیث کا استعمال۔ ریختی میں معکوس اور اسفل جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے اور ہندی شاعری میں کومل اور بہت بلند جذبات کا اظہار۔ غالباً بھگتی شعراء نے بھی صیغہ تانیث کے ذریعے اپنے جذبات عبودیت کو پیش کیا ہے۔ کریمی صاحب کے دو نعتیہ گیتوں کے یہ ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

میں تو نبی کے واسطے مالا بناؤں گی
نوری نوری مدینے کی ہر اک گلی
تم چلو تو چلو' ورنہ میں تو چلی

خیال آیا کہ یہ اظہار شاید روح شاعر کی طرف سے ہے اور ظاہر ہے کہ روح کے لئے صیغہ تانیث استعمال ہوگا۔ ایسے گیتوں میں نشاط اور حزن کی کیفیات عجب انداز سے یک جا ہوگئی ہیں۔

اس زمینِ مدینہ پہ آقاؐ چلے
اس کے رستوں پہ ان کے صحابہ چلے

اہل بیت نبیؐ اہل خانہ چلے
انہی گلیوں میں کھیلے ہیں ابنِ علیؓ
تم چلو تو چلو' ورنہ میں تو چلی

کھرے جذبے' چمکتے آنسوؤں کی چمک کے ایسے لمحوں میں بھی کریمی صاحب کو اپنے آقا کے پیغام کی یاد رہتی ہے۔ حرمین میں ''حنفی ومالکی' شافعی وحنبلی'' سب ایک ساتھ رب محمدؐ کے حضور جھکتے ہیں۔ یہ اتحاد ملت' اسی آقا کے دامن سے وابستگی کی ایک صورت ہے۔

زیادہ تر نعتیہ مجموعوں میں برکت اور آغاز کتاب کے لئے دو ایک حمدیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ کریمی صاحب کے مجموعہ ''آنکھ بنی کشکول'' میں حمدیہ غزلوں' نظموں اور گیتوں کی ایک کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ ویسے اب حمدیہ مجموعے بھی شائع ہونے لگے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ حمد ونعت کی یکجائی' اسلام کی روح سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہ ہمارے کلمے کا عکس ہے۔ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ہے کریمی کی دعا بخشش بھی ہو دیدار بھی
قربتِ احمدؐ بھی ہو اور بارشِ انوار بھی
انت خالق' انت واحد' انت تواب الرحیم
رب ہو مورے تم' رب ہو سبھی کے' ناؤ سبھی کی کھیوت ہو

اردو' فارسی ترکیب' عربی مصرعے' ہندی بھاشا' کریمی صاحب کے پاس جو کچھ ہے وہ سب اللہ اور ان کے رسول کے لئے ہے۔ زبان کی اس قوس وقزح کے ساتھ سرمژگاں چمکتے ستارے' سجدہ کرتا ہوا وجود' دل کی ہر دھڑکن' خیال کی ہر لہر' سب کچھ حاضر ہے۔ سب کچھ اس کے لئے ہے جس نے یہ سب کچھ دیا ہے اور اس کے رسولؐ کے لئے۔ میں یہ بات پہلے بھی عرض کرچکا ہوں اور آج اس مناسب سیاق وسباق میں دہراتا ہوں کہ

نعت پورے وجود کی شاعری ہے۔ قرآن کریم نے مسلمانوں سے کہا کہ ''اے اہل ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ'' کریمی صاحب حمد نگاری اور نعت گوئی کو ایمان کی ایک نشانی اور علامت سمجھ کر ایوان حمد و نعت میں داخل ہوئے ہیں۔ ان پر اور ان کی سرمستی و نے نوازی پر رشک آتا ہے۔ یہ آواز دوست کہاں سے آ رہی ہے۔ از کجامی آید ایں آواز دوست۔ جس طرح چراغ کی لو کی کوئی سمت نہیں ہوتی اسی طرح ہر جہت اس آواز کی جہت ہے۔ دل، دماغ، آنکھیں، کان، سب نغمہ سرائی میں مصروف ہیں۔ یہ شاعری، وجود کا سازینہ ''آرکسٹرا'' ہے۔

کریمی صاحب کے لئے حمد و نعت مکاں بھی ہے زماں بھی۔ ہر وقت حمد و نعت کا وقت ہے۔ انہوں نے طریقہ راسخہ میں بھی ایسی نعتیں کہی ہیں جن میں ان کی آواز غزل کے پیکر میں نعت کہنے والوں کی آوازوں میں بہت الگ اور مختلف ہے۔ ویسے تو ہر آدمی اپنی انفرادیت رکھتا ہے مگر نعت و غزل کی مروجہ اصطلاحوں اور علامتوں اور ترکیبوں کو اپنے لہجے اور ذات سے مسخر کر لینا الگ بات ہے۔ یہ تحریر میری گرفت میں نہیں آ رہی ہے۔ اسے بہر حال سمیٹنا ہے اور مناسب صورت یہ نظر آ رہی ہے کہ ان کی نعتوں کے کچھ شعر آپ کو سناؤں۔ دیکھئے کہ یہ فقیر خوش نوا، کیسی کیسی زمینیں ایجاد کرتا ہے۔

وقت دعائے نیم شبی، بولی کریمی، خاموشی
نقش کرو لوح جاں پر لاالہ الا اللہ

مل جائے کریمی کو کوئی چاکری ایسی
اجرت میں شب و روز کماتا رہوں نعتیں

نعت محبت، نعت عریضہ، نعت قصیدہ آقاؐ کا
نعت دلیل عشق نبیؐ انوار کی یہ پوشاک بھی ہے

خدا دکھائے یہ منظر نبیؐ کی مسجد میں
ہو اعتکاف میسر نبیؐ کی مسجد میں
ہے چہرہ چہرہ کریمی سوال اس در پر
ہے آنکھ آنکھ سمندر نبیؐ کی مسجد میں

آتی ہے جب بھی گردشِ ایام سامنے
آتا ہے بے محابہ لبوں پر نبیؐ کا نام
میں ایسے خوش نصیب فقیروں کا ہوں غلام
لکھتے ہیں جو نظر سے دلوں پر نبیؐ کا نام

کچھ اشک بکھر جاتے ہیں تحریر کی صورت
لکھتی ہیں کبھی حمد، کبھی نعت یہ آنکھیں

ان اشعار پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مسرور کیفی صاحب کی طرح کریمی صاحب کے لئے بھی نعت گفتگو کا درجہ رکھتی ہے، بلکہ یوں کہوں کہ ان کے شب و روز نعت سے عبارت ہیں۔ نعت کو محبت، عریضہ، قصیدہ، دلیل عشق نبیؐ کہہ کر انہوں نے نعت گوئی کی چار سمتوں کی نشاندہی کر دی ہے اور پانچویں سمت وہ ہے جب شاعر کی روح کا لباس بن جاتی ہے۔ نعت ہماری چادر آبرو ہے۔ جب حاتم طائی کی بیٹی جنگی قیدی کی حیثیت سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں

حاضر ہوئی تو اس کے سر پر چادر نہ تھی۔ اس کے بے چادری کا غم آپؐ کے چہرہ اقدس پر تحریر کی صورت ابھرا اور آپ نے اپنی چادر سے اس کی بے چادری کا ازالہ فرمایا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے اسرار خودی میں کہا کہ اقوام عالم کے سامنے ہم بھی بے چادر ہیں اور آپؐ ہمارے چادر بن گئے ہیں۔ اقبال نے سچ کہا۔

آبروئے ما زنام مصطفیٰ ست

نعت ہماری تمنا، جذبۂ اظہار اور گواہی کے ساتھ ساتھ لباس روح اور چادر آبرو ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب نعت، نام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بن جاتی ہے اور نام محمدؐ تو مستقلاً ثناونعت ہے اور حمد ونعت، الفاظ اور اظہار لسانی تک محدود نہیں۔

لکھتی ہیں کبھی حمد کبھی نعت یہ آنکھیں

کریمی صاحب محبت یافتہ اور ''کڑھے ہوئے'' آدمی ہیں۔ ان کی زندگی اور نعت فیضان نظر کی کہانی سناتی ہے۔

میں ایسے خوش نصیب فقیروں کا ہوں غلام
لکھتے ہیں جو نظر سے دلوں پر نبیؐ کا نام

اللہ کریمی صاحب کو کرامت کے ساتھ زندہ رکھے۔ ان پر یوں ہی رحمتوں اور کرامتوں کی بارش ہوتی رہے۔ وہ ان پھواروں میں بھیگتے رہیں اور سرسبز وشاداب ہوتے رہیں۔ (آمین)

(آنکھ بنی کشکول/ آفتاب کریمی، ۱۹۹۷ء، اقلیم نعت، کراچی)

نعت کے نئے افق

۱۹۷۶ء کے آغاز کی ایک رات تھی۔ جناب شیوا بریلوی کی یاد میں غالب لائبریری میں ایک نعتیہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ میں اس بزم سخن کے بیشتر شریک شعراء کو پہلی بار سن رہا تھا۔ جناب تابش دہلوی اور جناب صہبا اختر کے سوا شاید ہی کوئی بہت معروف شاعر اس بزم میں شریک رہا ہو۔ عین ممکن ہے کہ وہ تمام شاعر اپنے مخصوص حلقوں میں اعتبار اور شہرت کے مالک ہوں۔ کیونکہ کراچی کی شعری فضا اس شہر کی سی وسعت رکھتی ہے۔ اس محفل میں، میں نے جتنی اچھی نعتیں سنیں شاید ہی کسی اور نعتیہ مشاعرہ میں سنی ہوں۔ اور اس دن سے آج تک کئی بار میں اس بات پر غور کیا ہے کہ شہرت کتنی حقیر، غیر معتبر اور اتفاقی بات ہے۔

وقار صدیقی اجمیری صاحب کو اسی محفل میں میں نے پہلی بار سنا رات بھیگ چکی تھی۔ جب وہ مائیکروفون کے سامنے آئے اور انہوں نے اپنی نظم ''اسم گرامی'' سنانی شروع کی۔

حجابِ لفظ میں معنی کا حسن ہے مضمر
کوئی حجاب نہیں اس حجاب سے بڑھ کر
حجاب اسم سے اوجھل رُخ مسمّیٰ ہے
مسمّیٰ خود بھی حقیقت کا استعارا ہے

اس نظم کے تمہیدی شعر سنتے ہی میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شعر، شاعری کی طرح بھاری

بھر کم تھے اور یہ محض لفظوں کا کھیل نہیں تھا۔ یہ علم کی آواز تھی۔ علم ہی ہم سے ''حجاب اسم'' کی بات کرسکتا ہے۔ جب کہ اسم خود علم کی اساس۔ ''**علم آدم الاسماء**''

ظاہر ہے کہ اگر آدم کا علم حقیقتاً علم تھا (اور وہ تھالاریب فیہ) تو بقول صاحب مفردات مسمیٰ کے علم کے بغیر تعارفِ اسم بے حقیقت چیز ہے۔

معرفتہ الاسمالا تحصل الابمعر فتہ المسمیٰ

مگر جب مسمیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا فرد ہو' جو عالم بشریت کا نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ عبدومعبود کے درمیان عالم برزخ ہو تو رخ حقیقت کے ہر پردے کو کون اٹھا سکتا ہے پھر اس حقیقت کو بھی نظر میں رکھئے کہ اسم تو محض ایک علامت ہوتا ہے ایک اشارہ کسی حقیقت' کسی شئے اور کسی ذات کی طرف۔

چند تمہیدی اشعار کے بعد ذکر اس کا چھڑ گیا کہ ح۔م۔د۔جس کے نام کا مادہ ہے مگر جس کی ثناء نعت ٹھہری۔ سوچتا ہوں کہ جبھی تو ام الکتاب کے آغاز ہی میں حمد پر ال کو داخل کیا گیا ہے تاکہ ہمیں صراط مستقیم مل سکے اور ہم اس زیادتی سے بچ سکیں جس میں حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر علیہم السلام کے متبعین مبتلا ہوئے۔

مگر وہ نام جو توضیح حسن ذات بھی ہے
لباس لفظ میں معنی کی کائنات بھی ہے

اور جب نظم اس مقام سے آگے بڑھی تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم فکر کے ایوان سے ایک ایسے وسیع مرغزار میں نکل آئے ہیں جس کے درمیان جوئے نوررواں دواں روشنی لٹاتی اور دلوں کے آئینوں میں خود اپنا عکس دیکھتی آگے بڑھ رہی ہے۔ فکر اور جذبہ کی یہ ہم کناری اسم پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سہارے ہی شاعر کی قلم رو کا حصہ بن سکتی ہے۔ سلام ودرود اس ذات پر، اس کی آل پر، اس کی ازواج پر اور اس کے اصحاب پر۔

وقار صدیقی اجمیری کی یہ نظم اردو نعت گوئی کی طویل تاریخ میں جس کے کئی مناظر'

حصے اور گوشے میرے ذہن میں جگمگا رہے ہیں۔ ایک ہشت پہلو ہیرے کا درجہ رکھتی ہے۔ ایسا ہیرا کہ ایک طرف اسے محسن کاکوروی' اقبال اور ظفر علی خان کے بہترین نعتیہ کلام کے پہلو میں جگہ دینی ہوگی تو دوسری طرف یہ اس نئی روایت کا عنوان جلی ہے جو ہمیں آج نعت گوئی میں نظر آرہی ہے اور جس کے نمائندوں میں احمد ندیم قاسمی' تابش دہلوی' نعیم صدیقی' شورش کاشمیری' امجد اسلام امجد' سلیم احمد اور ثروت حسین وغیرہ شامل ہیں۔ اس نئی روایت میں ایک طرف عشق کے سارے قرینے' والہانہ انداز' اشارے اور کیفیتیں موجود ہیں اور دوسری طرف مقام رسالت کا مکمل عرفان اور آگہی۔

دین ودنیا مصطفیٰ تا مصطفیٰ (تابش دہلوی)

میری ناچیز رائے میں ہمارا عہد' نعت گوئی کی تاریخ کا ایک نیا عہد بن کر ابھرا ہے۔ میں نے اپنے استاد جناب محمد شمیم کو جب ''اسم گرامی'' سنائی تو انہوں نے کہا کہ ابوالخیر! اکیسویں صدی کی شاعری' میرے اور تمہارے سرکار کی مدحت کی شاعری ہوگی اور یہ نظم اسی دعوے کی ایک روشن دلیل ہے۔'' اس رات جب میں نے وقار صدیقی اجمیری سے یہ نظم پہلی بار سنی تھی تو یہی بات محسوس کی تھی' مگر میرے احساس کو الفاظ کا جامہ نہ مل سکا تھا کیونکہ مدحت سلطان مدینہ کی منزل وہ منزل ہے جہاں۔

شعور سر بگریباں' خجل غرور خرد
ہے چاک چاک جنوں کی جسارتوں کی سند

چودہ صدیوں کی دوری نے ہمیں ذات محمدیؐ سے بہت دور کردیا ہے۔ قرآن حکیم نے واشگاف انداز میں ہمیں یہ حقیقت عطا کردی ہے کہ ''لقدکان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ۔'' مگر اسوہ حسن کی دولت بیدار کو عہد حاضر کے خرابہ ظلمات میں ہم گم کر بیٹھے ہیں۔ اس کے باوصف محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک نام نہیں بلکہ ایک قوم کا تشخص ہے اور تشخص بھی ایسا جس نے جغرافیہ کو خجل کر دیا۔ قومیت کے تصور کو نئی اساس دی ہے' نظریہ

کو خطہ سے بالاتر بنا دیا ہے اور تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا ہے۔ یہ وہ ذات تھی جس کی ہجرت نے یثرب کو مدینہ بنا دیا اور شاید اسی نکتہ میں وہ بات مضمر ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ ہجرت وہ بیج ہے جس سے قومیت اسلام کا شجر سایہ دار پھوٹا ہے اور پھر سارے عالم پر چھا گیا ہے۔

اقبال نے ایک مصرع میں اس حقیقت کو یوں سمو دیا ہے۔

آبروئے ماز نام مصطفیٰ

اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں نام محمدؐ اور احمدؐ بھی میرے نزدیک وحی الٰہی کا ثمرہ ہیں۔ یہ نام حضرت عبدالمطلب اور حضرت آمنہ نے خود نہیں رکھے بلکہ ان کے دلوں میں ڈالے گئے۔ کیونکہ یہی وہ نام ہیں جو صحف اولیٰ میں ملتے ہیں اور خود قرآن حکیم نے جس پیرائے میں آپ کے ان دونوں ناموں کو پیش کیا ہے اس سے میرے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ **اسمہ احمد(۲ /۶۱) اور محمد رسول اللہ(۴۸/۲۹)**

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مقام محمود پر فائز فرمائے گئے۔ یہ وہ مقام ہے جو حمد وثنا، تعریف وستائش کی وجہ تام ہوتا ہے اور اس مقام محمود پر فائز ہونے والا یہ نازش بشریت حمد رب میں اس درجہ ڈوب گیا کہ احمدؐ بن گیا اور اس احمدیت نے اسے محمدؐ بنا دیا۔

''اسم گرامی'' میں جناب وقارؔ صدیقی اجمیری نے نہایت درجہ شعور وعلم کے ساتھ محمدؐ کو اسم گرامی قرار دیا ہے۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہے جس کی مسلسل حمد وستائش کی جائے جبکہ محمود وہ ہے جس کی ایک بار حمد کی جائے، یوں جناب وقار صدیقی اجمیری کے قلب ونظر کی لوح پر مقام محمود سے مقام محمدی تک کے تمام مناظر اور مراحل رقم کر دیے گئے ہیں۔

سطور بالا جس نظم سے متعلق لکھی گئی ہیں وہ آپ اس مجموعہ میں ملاحظہ کریں گے،

اسی لئے میں مثالوں سے دامن کشاں گزرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ یہ سعی ناتمام ہے۔ پھر دامن کشاں گزرنے کی سعی تابکے؟

یہ نام حسن بصیرت، یہ نام نور ہی نور
یہ نام فکر کا رہبر، یہ نام اساس شعور
یہ نام دائرہ حق وسیع کرتا ہے
تعلقات من و تو وقیع کرتا ہے
یہ نام وحدت اقوام کی ضرورت ہے
یہ نام خلق ہے اخلاص ہے محبت ہے
یہ نام دین ہے، تہذیب ہے، تمدن ہے
ثقافتوں کا امیں، عدل کا تعین ہے
یہ نام امن کی تحریک ہے، محبت ہے
یہ نام ایک وسیع وعریض رحمت ہے

میں بہت سے جدید نقادان فن نعت کی طرح شمائل اور ''سراپائے رسول کی پیشکش کے خلاف نہیں ہوں۔ ہمارے اچھے نعت گو شعراء کے نعتیہ سراپے محدود میں لامحدود کی تلاش سے عبارت ہیں۔ مثال کے طور پر محسنؔ کاکوروی کے سراپا کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی گیسوئے رسول کا سلسلہ واللیل سے اور چہرہ اقدس کا رشتہ والضحیٰ سے قائم ہے۔ اصل مسئلہ نعت کے سلسلہ میں شاعرانہ لغت (Diction) کی تلاش اور انتخاب کا ہے۔

نعت ہم سے ہوش مندی اور انتخاب کا مطالبہ کرتی ہے۔ نعت گو شاعر ہر لفظ کو اسی طرح پرکھتا ہے جیسے جوہری ہیرے کو اور پھر ہشت پہلو الفاظ کے ہیروں سے نعت کا ہار خلوص کے دھاگے سے پروتا ہے۔ نعت کے الفاظ میں ۱۔خلوص۔۲، گہری معنویت۔۳، تہ داری۔۴، عظمت۔۵، عشق۔۶، فکر۔۷، روانی ۔۸، ایک دوسرے سے ہم آہنگی کا اجتماع

ضروری ہے۔ وقار صدیقی اجمیری کے الفاظ میں یہ آٹھوں پہلو مجھے جگمگاتے نظر آئے ہیں، وہ ہر لفظ کو امانت اور ودیعت عشق دوست سمجھتے ہیں۔

میں نے جو اشعار پیش کئے ہیں ذرا ان کی (Diction) پر نظر ڈالئے 'بصیرت' کی جگہ بصارت بھی موزوں کیا جاسکتا تھا یا دید سے متعلق دوسرے لفظ، مگر نام کا رشتہ بصیرت ہی سے قائم ہوسکتا ہے کیونکہ بصیرت محض قوت دید ہی نہیں اس میں دروں بینی بھی موجود ہے اور چمک کا پہلو بھی، مزید برآں بصیرت، علم، ادراک اور ذہانت کو بھی کہتے ہیں۔ کسی علم پر گہری نظر اور ادراک رکھنے والے کو ہم مبصر کہتے ہیں۔ اور آگے چلئے تو بصیرت میں شہادت، حجت اور دلیل کی دنیائیں بھی سمٹ آتی ہیں۔ حسن بصیرت کے بعد اگلا ٹکڑا ہے ''نور ہی نور'' نور کے معنی محض روشن اور روشنی کے نہیں۔ نور وہ شے ہے جو خود بھی روشن اور واضح ہو اور دوسری اشیاء کو بھی روشنی عطا کرے۔ پھر یہ کہ نور ذاتی حقیقت ہے۔ اور ضیاء مستعار روشنی کو کہتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ حسن بصیرت اور نور میں مقام محمدیؐ کا روشنی بخش پہلو کس طرح پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

ہر کجا بینی جہان رنگ وبو
ہر کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنور مصطفیٰ او رابہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ است

(اقبال)

''یہ نام فکر کا رہبر، یہ نام اساس شعور''

فکر کے معانی ہیں کسی معاملے یا مسئلے میں ترتیب کے ساتھ غور کرنا اور عقل ونظر سے کام لینا۔ اس عمل کے نتیجے میں آدمی واضح نتائج اخذ کرتا ہے، یوں اخذ نتائج فکر کا ثمرہ ہے۔ فکر کا تعلق بنیادی طور پر ان اشیاء سے ہے جن کا تصور ذہن انسانی میں قائم

ہوسکے۔ اور شعور، فکر کے بعد کی منزل ہے۔ جس کا علاقہ اخذ نتائج کے بعد باریکیوں میں اترنے سے ہے۔ احساس اور شعور کے بعد جب آدمی اپنے حواس سے اردگرد کی دنیا کو زیر ادراک لے آتا ہے تو معرفت رب کی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے فکر اور شعور کے ذکر کے بعد ہی وقار صدیقی اجمیری کہتے ہیں۔

یہ نام دین ہے، تہذیب ہے تمدن ہے
ثقافتوں کا امیں، عدل کا تعین ہے

اس شعر میں اگرچہ تہذیب، تمدن، ثقافت اور عدل کا تذکرہ ہے مگر یہ صرف وہ دائرے ہیں جو دین کے مرکزی نقطہ کے گرد کھینچے گئے ہیں۔

یوں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک طرف ہمارے لئے حسی اور ادراکی علم کی سند اور ایمان ہے دوسری طرف وہ ''ہمہ دیں'' ہے۔ اور اگلے شعروں میں انہی دائروں کو پیش کیا گیا ہے۔ ''وحدت ادیان'' ''رحمت'' ''تعلقات من وتو'' اس مرحلہ پر یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ان معروضات سے فن نظم گوئی پر وقار صدیقی اجمیری کی گرفت اور قدرت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان کی عمر اور دبستان فن کے دوسرے شاعر نظم گوئی کے آداب سے اس طرح واقف نہیں ہیں۔ غزل کے سب سے بڑے مخالف حضرت جوش ملیح آبادی کی بیشتر نظمیں غزل مسلسل ہیں جن کا تسلسل فکری نہیں جذباتی ہے۔ وقار صدیقی اجمیری کی نظموں میں ہمیں منطقی اور فکری تسلسل ہر جگہ ملتا ہے یہ الگ بات کہ جذباتی تسلسل اسی فکری تسلسل کے نتیجے میں پیدا ہوجاتا ہے۔

جی چاہتا ہے کہ دین کے بعد تہذیب، تمدن، ثقافت اور عدل کی ترتیب اور دین سے ان کے تعلق پر تفصیل سے کچھ لکھا جائے مگر نہ یہ اس کا موقع ہے اور نہ اس وقت راقم الحروف کو اتنی فرصت ہے۔ یہ تو محض تذکرہ رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کے لئے اس سگ غلام غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چند سطریں

قلم برداشتہ لکھ دی ہیں۔ کیونکہ سعادت ذکر حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مجھ میں یہ ہمت بھی نہیں تھی کہ ایک عاشق رسولؐ شاعر سے انکار کرکے روز قیامت اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمسار ہوتا۔

مختصر یہ کہ وقار صدیقی اجمیری نے جس مقام پر اور جس قرینے سے دین کا لفظ استعمال کیا ہے اس میں اس کائنات جیسی وسعت رکھنے والے لفظ کے بہت سے معانی سمٹ آئے ہیں۔ دین اطاعت وفرماں برداری بھی ہے‘ اور غلبہ اقتدار بھی‘ دین مجموعہ شعائر مذہب بھی ہے اور آئین مملکت بھی‘ اس میں تدبیر الٰہی بھی ہے اور عادت رب بھی‘ اور پھر وہ دن بھی جو ہمارے اعمال کے لئے یوم حساب ہوگا۔ دین کے دائرے میں ’’تعلقات من وتو‘‘ کی دنیا بھی آجاتی ہے۔ وہ رشتہ جو میرے اور وقار صدیقی اجمیری کے درمیان ہے‘ وہ رشتہ جو میرے اور آپ کے درمیان ہے‘ اور یہ اسم پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے جس نے ہر نسلی‘ لسانی‘ علاقائی اور جغرافیائی حدبندی اور تعصب کو ڈھا کر یہ رشتہ اور تعلق استوار کیا ہے۔

’’یہ نام ایک وسیع وعریض رحمت ہے‘‘

وماارسلنک الا رحمتہ للعالمین۔ کی شعری تعبیر سات لفظوں میں بھلا کوئی اور کس طرح پیش کرسکتا ہے؟

’’اسم گرامی‘‘ کے علاوہ وقار صدیقی اجمیری نے کئی اور اہم نعتیہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں میں ان کا نعتیہ قصیدہ ’’محبت کا حرم‘‘ بھی شامل ہے۔ ہمارے ایک ترقی پسند (بزعم خود) نقاد نے کوئی بیس پچیس سال پہلے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ’نعت گوئی اور قصیدہ گوئی کا دور ختم ہوگیا‘‘ اسے بھی حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ سمجھئے کہ ان ’’بزرگ‘‘ کے اس ’’ارشاد‘‘ کے بعد ہی نعت گوئی کے مضامین وسیع ہوتے چلے گئے۔ نعت گوئی کے نئے پیرائے اور نئے اسالیب سامنے آئے‘ جدید ذہن نعت گوئی کی طرف ایک

نئی دروں بینی اور کائنات نظری کے ساتھ متوجہ ہوا۔ اور آج کے کئی شاعروں کے مجموعوں میں نعت محض تبرکاً نہیں ملتی بلکہ ایک عظیم ادبی صنف کے طور پر نظر آتی ہے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مسیحانفسی کا یہ کرشمہ تو دیکھئے کہ اس نے قصیدہ گوئی کو بھی ایک نئی زندگی عطا کردی‘ عزیز لکھنوی کے قصائد منقبت کے بعد اب یہ شرف جناب وقار صدیقی اجمیری کو عطا ہوا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی کو ایک عظیم مقصد کے لئے اس کے پورے فنی لوازم اور شرائط کے ساتھ برت رہے ہیں۔

ان کے اس قصیدے میں ۹۲ شعر ہیں۔ جو اسم محمدؐ کے اعداد کو پیش کرتے ہیں۔ تشبیب‘ گریز‘ مدح‘ مطلع ثانی کا اہتمام‘ فنی طور پر اس قصیدے میں سب کچھ موجود ہے۔ اور وہ شوکتِ لفظی بھی جسے گداز قلب نے مسخر کردیا ہے۔ جناب وقار کے آہوئے قلم نے وادی بے راہ اور وادی ہزار راہ نعت میں اپنے لئے اپنا راستہ تراشا ہے۔ وہ راستہ جو ذہن پاکیزہ‘ فکر‘ بصیرت اوراس جرات کے بغیر تراشا ہی نہیں جاسکتا تھا جو شبنم کو جلوہ مہر دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ اپنے حوصلوں سے وقار صاحب نے یوں خطاب کیا ہے۔

ہمتِ شوق کمربستہ مدحت ہو جا
رام کرنا ہے مجھے آج خیالات کا دم

اسی خطاب کو انہوں نے مطلع ثانی کی اساس بنایا ہے۔ اور مطلع ثانی میں بھی قصیدے کی روایت کے مطابق خطاب کیا مگر ساقی سے نہیں بلکہ تشنہ لبوں سے‘ کیونکہ یہ قصیدہ ہی ساقی میکدہ کا ہے جو اپنی محبت کی شراب جس قدر عطا کرتا ہے تشنگی اسی قدر بڑھتی ہے۔

وہ مدینے سے اٹھا جھوم کے پھر ابر کرم
مژدہ اے تشنہ لبو! آ گیا رم جھم موسم

اس قصیدے کی علمیت اور تلمیحات بھی اردو اور فارسی کے بہترین قصیدوں کی یاد

دلاتی ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ ان مقامات میں تلمیح اور تاریخی حوالے موجود ہیں جہاں پہلی نظر میں ان کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ تلمیح ہو یا صنائع بدائع۔ ان کے وجود کا جواز محض یہ ہے کہ خیال ان سے چمک جائے۔ محض صنائع بدائع کی خاطر شعر کہنا کاریگری تو ہے، شاعری نہیں۔ شاعری تو ایک جذبہ ہے، شعور ہے، آہنگ ہے۔ ایسا آہنگ جس میں آہنگ الفاظ سے لے کر آہنگ ذات تک سارے آہنگ ہم آہنگ ہو جائیں۔
قصیدے کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

مدنی چاند ہے آئینہ اوصاف خدا
حسن مطلق کا کوئی اور نہیں ہے محرم

''مدنی چاند'' وہ تلمیح ہے جس پر پردہ نشینان شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تا ابد ان کی امت کے ہر فرد کا احساس جمال سمٹ آیا ہے۔ یہ نغمہ پہلی بار فضا میں اس وقت گونجا تھا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدم نے یثرب کو مدینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا دیا تھا۔

طلع البدر علینا
من ثنیات الوداع
ہم پر چاند طلوع ہوا
وداع کی گھاٹیوں سے

اور یہ نغمہ اس وقت بھی عہد رسالت میں گونجا تھا جب سرکارؐ غزوہ تبوک سے لوٹے تھے۔ یہی نغمہ وقارؔ صدیقی اجمیری کی روح میں گونج کر صفحہ قرطاس پر ابھر آیا ہے، مگر نئے سیاق وسباق کے ساتھ۔ مدنی چاند، ربانی سورج کے پرتو سے ضیاء گستر ہے۔ یوں انہوں نے چاند کے لفظ کو اس دعوے کی دلیل بنا دیا ہے کہ:

''حسن مطلق کا کوئی اور نہیں ہے محرم''

اس قصیدے میں ''سراپائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خاصے کی چیز ہے۔ میں نعت گوئی کے سلسلے میں شاعرانہ لغت کا ذکر کر چکا ہوں۔ ناکام سراپا، معاذ اللہ حسن خلاصۂ کائنات کو کسی مہ جبیں کی سطح پر لے آتا ہے لیکن جب منصب رسالت سے باخبر شاعر قرآن کے آئینے میں عکسِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتا ہے اور شمائل میں تفصیلات کے براعظم میں خلاقانہ سفر کرتا ہے تو ایسا سراپا لکھتا ہے کہ حسن محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی صفات کے عظیم مظہر کی طرح زمین سے فلک تک نظر آتا ہے۔ محسؔن کاکوروی کا سراپا اردو کے نعتیہ ادب میں ایک سنگ میل بھی ہے اور چیلنج بھی۔

حقا کہ وہ جسم سر سے تا پا
ہے شاہد غیب کا سراپا
ابرو پہ جبیں مہ شمائل
رکھی ہوئی رحل پر حمائل
پیشانی ہے جزو مصحف رو
اس پارے کے دو رکوع ابرو
جوہر کا بھرا ہوا خزینہ
آئینہ بے مثال، سینہ
اس گردن صاف کی بلندی
تکبیر، فریضہ سحر کی
رعنائی، قامت مناسب
روزے میں اذان وقت مغرب

میں نے حضرت محسن کاکوروی کے یہ شعر اس لئے آپ کی خدمت میں پیش کردیئے تاکہ آپ کو اندازہ ہوسکے کہ ہماری نعتیہ شاعری میں ''حسن سراپا'' کی یہ

حدشاعرانہ فکر اور رعنائی خیال نے قائم کی تھی پھر مثنوی کے پیکر میں قافیہ کی گرفت اتنی سخت نہیں ہوتی جتنی قصیدہ میں، لیکن دیکھئے کہ سراپا لکھتے ہوئے وقار صدیقی اجمیری نے آ بگینہ کو تندئ صہبا سے کس طرح پگھلا دیا ہے، مقصد محسن کاکوروی سے موازنہ نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ

ع ''تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن''

اگر ابرو سے ہے قوسین کا واضح مفہوم
خم ابرو سے شرف یافتہ محراب حرم
جنبش ابروئے خمدار مشیت کی کلید
جس کا ہر حکم ہے اطلاق میں مطلق مبرم
دہن قدس کی نکہت ہے بہاروں کی مراد
اور زباں ناشر آیات الٰہی پیہم
چہرہ قرآن کی تفسیر بہ عنوان جلی
کرم اللہ تعالیٰ علیٰ وجہ الاکرم
سینہ گنجینہ اسرار خداوند قدیر
پشت پر مہر نبوت سے ہے اتمام نعم
پائے اقدس کا ہر اک نقش ہے منزل بکنار
پائے اقدس پہ جبینِ مہ وخورشید ہے خم

وقار صدیقی صاحب کی ایک نظم ''آداب محبت'' فن نعت گوئی پر منظوم تنقید کا درجہ رکھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سیپیاں خالی ہیں اور محبت کے موتی ذات کے سمندر میں رہ گئے اور نعت گوئی تو علاج بے قراری محبت ہے اور بس۔ ویسے نعت کے ادبی مقام کو انہوں نے کس خوبی کے ساتھ ایک مصرع میں پیش کردیا ہے نعت۔

ع صاحب معراج کی نسبت سے خود معراج ہے

پھر جناب وقار کے اس مجموعے میں مجھے ایک نظم پر کئی عنوان لکھے نظر آئے ہیں۔ ''حقیقت کبریٰ، واصف، موصوف،وصف'' اور ''ایک مثلث'' اگر یہ میری نظم ہوتی تو میں اسے ''ایک مثلث'' کا عنوان دیتا۔ اس نظم میں ایک طرف دریا کی موجوں کے سمٹنے اور پھیلنے کا منظر ہے تو دوسری طرف اس میں الفاظ کا استعمال اقلیدس کے خطوط کی طرح کیا گیا ہے اور پھر اقلیدس کے اضلاع مساوی کو''واصف،موصوف اور وصف'' کے مساوی قرار دے کر ''قدر'' کا مسئلہ پیدا کیا اور'اقلیدس' الجبرا بن گئی۔

نہیں ذوق بیاں پر بند
دروازہ ستائش کا
مگر میں اور ہی کچھ سوچتا ہوں
ایک مدت سے
کہ واصف، وصف اور موصوف
اضلاع مساوی سے
مثلث
معتبر توصیف کا
مل کر بناتے ہیں

مجھے طریقہ راسخہ اور پرانے دبستان فکر کے شاعر کے ہاں آزاد نظم دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ آج کل نثری نظم پر بحث ہو رہی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ لوگوں کو کیا ہوگیا کہ پیکر پر بحث کرتے ہیں (اگرچہ آہنگ وغیرہ کا تذکرہ بھی کرتے ہیں) حالانکہ اصل چیز تو شاعری اور روح شاعری ہے۔ شاعری اپنے اظہار میں کسی ایک پیکر کی نہ تو قائل اور نہ پابند۔ وقار صدیقی اجمیری نے ایک طرف تو قصیدے کی پابندیوں کو طوق

غلامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح قبول کیا اور دوسری طرف آزاد نظم کے وسیلے سے انہوں نے محمدؐ (فداہ ابی وامی) کے غلاموں کی آزادی کا منشور لکھا ہے۔ عشق محمدؐ کا یہ اظہاری اور ادبی پہلو مزید مطالعے کا مستحق ہے۔

میں آپ کی سمع خراشی کے لئے معذرت طلب ہوں اور اپنی خواہش اور تمنا کے باوصف ''شعور کا سفر'' میں شاعر کی ہم عنانی اور ہم قدمی کی سعادت سے اپنے آپ کو محروم کررہا ہوں۔ یہ سفر اپنے استاد جناب محمد شمیم کے لئے چھوڑ رہا ہوں کیونکہ مجھے ان کی ادبی خضر صفتی پر بھروسہ ہے اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے علاقہ سے باخبر ہوں۔

آخر میں آپ کو وقار صدیقی اجمیری کی ایک رباعی سنانا چاہتا ہوں۔ میرے علم کی حد تک اس رباعی کے پہلے اور چوتھے مصرعے کی تشبیہیں اردو شاعری کے لئے وقار صدیقی اجمیری کی سوغات ہیں۔

دریا میں روانی کی طرح زندہ ہیں
ادوار زمانی کی طرح زندہ ہیں
اب بھی ہیں بہر طور محمدؐ موجود
قرآن میں معانی کی طرح زندہ ہیں

مجھے اردو صرف اس لئے عزیز نہیں کہ یہ میری زبان ہے۔ مجھے اردو زیادہ عزیز اس لئے ہے کہ اس کے دامن میں ایسی نعتیہ شاعری بھی ہے اور احمد ندیم قاسمی کی طرح وقار صدیقی اجمیری بھی کائنات کے فصیح ترین انسان کی خدمت میں یہ عرض کرسکتے ہیں کہ

''میرا فن کرتا ہے بیعت تیری''

وقار صدیقی سے

وقار مصطفیٰ الفاظ کے پیکر میں تابندہ
نگاہ مصطفیٰ کی مہر سامانی
ترے اشعار کے مطلع سے پیدا ہے
مناظر انفس وآفاق کے روشن
اسی ذات گرامی کی بدولت ہیں
کہ جس سے فکر تیری ہوگئی روشن
وہی ذات گرامی آیت معراج انساں ہے
تجھے جس کے تصور سے تخیل کی ملی دولت
سراپا تو نے لکھا شاہد حسن محمدؐ کے تخیل سے قلم لے کر
سیاہی اس قلم کے واسطے زلف محمدؐ سے ملی تجھ کو
ترے اشعار میرے دل کی دھڑکن ہیں
قرینہ ہیں محبت کا

(ڈاکٹر ابوالخیر کشفی)

(حرف حرف خوشبو/ وقار صدیقی اجمیری، ۱۹۹۸ء، فرید پبلشرز، کراچی)

طلوع

مولانا قمر احمد عثمانی ایک علمی وادبی سلسلۃ الذہب کی درخشاں کڑی ہیں۔ وہ ان اربابِ کمال میں سے ہیں جو شہرت سے بے نیاز اپنے نفسِ مطمئنہ کے ساتھ وطنِ عزیز کے دور دراز اور چھوٹے مقامات میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں اور جنہیں یہ احساس بھی نہیں کہ ان کی نیکیاں اور شب وروز ان کے اہلِ وطن کے لئے برکت کا سامان ہیں۔ اگر انہیں یہ احساس ہوجائے تو برکت ختم ہوجائے گی کیونکہ اپنی اہمیت کا احساس اور نیکی کا پندار تکبر کی بدترین صورتوں میں سے ہے۔

میں نے قمر صاحب کے سلسلے میں سلسلۃ الذہب کی ترکیب استعمال کی ہے ان کے والدِ گرامی علامہ ظفر احمد عثمانیؒ ایک معتبر عالم اور ملّی رہ نما تھے جنہوں نے قائداعظمؒ کے فرمانے کی مطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مشرقی پاکستان میں پاکستان کے پرچم کی پرچم کشائی کی‘ ان کے برادرِ بزرگ مولانا عمر احمد عثمانی نے آٹھ جلدوں میں فقہ القرآن مرتب کی اور ایک بڑا لسانی کارنامہ جو بنیادی طور پر ان کے علم اور کاوش کا نتیجہ تھا ان کے نام کے حوالے کے بغیر شائع ہوچکا ہے۔ حجۃ الاسلام مُرشدِ تھانوی ان کے والد کے ماموں اور خاندان کے بزرگ تھے۔ یہ سلسلہ خدمتِ ادب ان کے خاندان میں جاری ہے عزیزۂ گرامی رفعت ہمایوں ان کی بھانجی ہیں اور بہت اچھا لکھتی ہیں۔

مولانا قمر احمد عثمانی کا قیام ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہے جسے ہم نے منٹو کے افسانے کے حوالے سے جانا‘ اور مدتوں اسے ایک علامتی اور فرضی مقام سمجھتے رہے‘ ان کا جزوی مستقر

کمالیہ ہے جو کھدر پسندوں کے لئے بڑی اہم بستی ہے۔ مولانا قمر احمد عثمانی مدتوں کُلیۂ اساتذہ میں استادوں کو پڑھاتے رہے اور مجھے یقین ہے کہ ہر دن بعثت معلما کے الفاظ انہوں نے اپنے لئے دہرائے ہوں گے اور وہ نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوں گے۔ جس نے انہیں سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کا موقع عطا کیا۔معلّمی محض پیشہ نہیں سنتِ نبوی (علیٰ صاحبہاالف الف سلام) بھی ہے۔الاعمال بالنیات

قمر صاحب اپنے بزرگوں کے وراثت داراوران کی روایات کے امین ہیں انہوں نے بچپن سے اس نکتے کو سامنے رکھا کہ

میراثِ پدرخواہی علمِ پدر آموز

یہی حقیقت میراث ہے۔

جناب قمر احمد عثمانی کثیر الجہات مصنف ہیں۔علمِ دین تو ان کے گھر کی شناخت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی تاریخ سے بھی شغف رکھتے ہیں اور اپنے گھر کے تقاضوں کے پس منظر اور تناظر میں اسلامی تحریکوں اور جدوجہد کا تجزیہ کرتے رہے ہیں۔ مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ‘ سیدنا عثمانؓ بریلی سے بالاکوٹ‘برصغیر میں دعوتِ دین کی تحریکیں اور ضبطِ تولید ان کی مقبول اور معیاری کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے عنوانات ہی سے قمر صاحب کے علمی افق کے پھیلاؤ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

علماء کی صف میں ہمیں اچھے شاعروں کے نام ہردور میں نظر آتے ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کی شاعری طبع موزوں کے جلوے اور تماشے سے آگے نہیں بڑھتی۔ قمر احمد عثمانی صاحب کی شاعری ان کی ذات اور مزاج کی جلوہ گری اور عکاسی کرتی ہے۔ وہ شعر کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ اس میں وہ مولانا مفتی محمد شفیع کے صاحب زادے ذکی کیفی مرحوم کی یاد دلاتے ہیں۔

قمر صاحب کی شاعری ان کی زندگی عکس اور روداد ہے۔ انہوں نے اپنا لڑکپن اور نوجوانی اپنے والد محترم کے ساتھ علم وادب کی محفلوں کے علاوہ مسلم لیگ اور جمیعتہ العلمائے اسلام کی سرگرمیوں میں گزاری۔ اس پر اضافہ کیجئے ان کی دردمندی اور سیاسی شعور کا۔ ان کی شاعری میں سیاست کے اشارے اسی ماضی کا عطیہ ہیں۔ ان کی حمد ونعت میں مشاہدے کے ساتھ ان کی حق نگری میں شامل ہے۔ رہی ان کی غزل تو اس قیامت سے کون نہیں گزرا ہے جسے جوانی کہتے ہیں' ہاں جوانی کے جذبوں اور شدتوں کی تہذیب کرنے والے ہی اچھی غزل کہہ سکتے ہیں۔ قمر صاحب کی غزل حسرت اور جگر کی روایات کی یاد تازہ کرتی ہے۔ میں حسرت اور جگر کے اندازِ تغزل کے فرق اور ان کے مضامین کے درمیان مختلف مرحلوں سے کچھ ا یسا بے خبر نہیں' اسی لئے میرے اس بیان کو آپ یوں ہی رد کرنے کی جگہ اس نکتہ کو سنجیدگی کے ساتھ قمر صاحب کی غزل میں تلاش کیجئے۔

طبع زاد شاعری کے علاوہ قمر صاحب نے بنگلہ شاعری اور بالخصوص شاعرِ انقلاب وشباب قاضی نذرالاسلام کی باغیانہ اور رومانی شاعری کے نہایت اچھے ترجمے کئے ہیں۔ ان منظوم ترجموں کا مجموعہ'' میں ان کے ترانے گاتا ہوں'' کے عنوان سے شائع ہوگیا ہے۔ ایک فرانسیسی اہلِ نظر نے کہا کہ ترجمے عورتوں کی طرح ہوتے ہیں اگر خوبصورت ہوں تو وفادار نہیں ہوتیں اور اگر وفادار ہوں تو خوبصورت نہیں ہوتیں۔ مشرق کی سرزمین حسن ووفا کے امتزاج اور یک جائی کی سرزمین ہے۔ قمر احمد عثمانی صاحب نے بنگلہ شاعروں کے مضامین اور اسالیب دونوں کے ساتھ وفا کا ثبوت دیا ہے ۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں انہوں نے اپنی زندگی کا وہ حصہ گزارا ہے جب دن میں دھنک رنگ خواب نظر آتے ہیں۔ رگوں میں خون کی روانی میں سیمابی کیفیت ہوتی ہے اور فطرت انسان پر اپنے اسرار منکشف کرتی ہے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان سے محبت بھی کی اور اسے سمجھا بھی۔ ان کے یہ ترجمے ماہِ نو' افکار اور دوسرے رسالوں میں اسی زمانے میں شائع ہوئے اور صاحبانِ نظر

کی نظر میں حرفِ اعتبار کی صورت چمکے۔ اگر ہم لوگوں کے درمیان قمر عثمانی جیسے لوگ ہوتے' خواہ اقلیت ہی میں تو شاید بنگلہ دیش آج بھی مشرقی پاکستان ہی ہوتا اور کون جانے کہ اگر ہم محبت سے اسم اعظم کو اپنالیں تو مستقبل پھر وحدت کے اسباب پیدا کرسکتا ہے۔

اب طلوع کی صورت میں قمر صاحب کا منتخب کلام ادبی دنیا کے سامنے آرہا ہے۔ ٹیلی ویژن' انٹرنیٹ اور برقیاتی نظامِ ابلاغ کے اس دور میں ادب کے مستقبل کا سوال اہم تر ہوتا جارہا ہے۔ اور ایک نیم خواندہ اوراحتیاج زدہ معاشرے میں تو ادب کے حال کے بارے میں ہی شک ہے' مستقبل کی بات کون کرے؟ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے اور اس میں کتابوں کے اڈیشن ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ ان حالات میں یہ بات قمر عثمانی صاحب کی رجائیت کی دلیل ہے کہ وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کررہے ہیں۔

اس مجموعے میں حمد ونعت کے علاوہ چند نظمیں اور قطعات شامل ہیں اور بڑا حصہ غزل پر مشتمل ہے۔

موجودہ ادبی دور نعت کے فروغ کا دور ہے۔ جتنے نعتیہ مجموعے گزشتہ چند برسوں میں شائع ہوئے ہیں کسی اور دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس بارے میں تھوڑی دیر میں کچھ عرض کروں گا' پہلے ذرا حمد کے سلسلے میں دو ایک باتیں۔ اگرچہ حمد کے چند مجموعے بھی گزشتہ برسوں میں شائع ہوئے ہیں اور حمد کے انتخابات بھی' مگر اس صنف کو فنی اور فکری طور پر زیادہ فروغ حاصل نہیں ہوسکا۔ اس کا ایک سبب تو وہی ہے جسے اقبال نے ایک مصرعے میں سمیٹ لیا ہے۔

خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر

اور دوسرا بنیادی سبب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ سے بہت دور ہوگیا ہے اور جب آدمی اپنے آپ سے دور ہوجائے تو اس حقیقتِ کبریٰ تک اسے رسائی کب حاصل ہوسکتی ہے جو اس کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔ ایک اور بنیادی سبب اس کے صحیفہ سے

دوری ہے اللہ کے بارے میں وہی کچھ جان سکتے ہیں جس سے اس نے خود ہمیں آگاہ کردیا ہے۔ ورنہ ذات وصفات کو اپنی عقل کے سپرد کرنے والے 'ذکر رب سے گزر کروادی وہم وگماں میں بھٹک جارہے ہیں اور اسے حسنِ بتاں اور ''پسر لکشمن ورام'' میں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ جناب قمر عثمانی کے مجموعے میں دو حمدیں اور ایک مکالمہ انسان وخدا شامل ہے۔

لیکن ان چند اشعار میں معرفتِ رب کی کیسی روشن آیات موجود ہیں اور انفس وآفاق کو شاعر نے کس طرح اپنے جلوہ حق کا گواہ بنایا ہے۔

جلوہ مہر و مہ و کاہکشاں میں دیکھوں
یا تجھے برزخ واعراف وجناں میں دیکھوں
ڈر یہ لگتا ہے کہ کافر ہی نہ ہوجاؤں کہیں
تیرے جلووں کو اگر حسنِ بتاں میں دیکھوں

اور پھر صدائے لاہوتی نے دید کی منزل کو یوں آشکار کردیا۔

دفعتہً عالمِ لاہوت سے آئی یہ صدا
دل کے آئینے میں یا شہ رگِ جاں میں دیکھوں

یہ صدائے لاہوت ہوتی تو شاعر کے لئے ہے لیکن شاعر کے اندر جو عالم ہے اسے یہ ہدایت عطا کی گئی کہ اسے اس کے آئینہ میں دیکھو۔ وہ آئینہ قرآن کریم ہے۔

تیرے اوصاف وکمالات ہیں بے حد وحساب
ہے مناسب انہیں '' تیرے ہی بیاں ''میں دیکھوں

اور حدیث نبوی کے مطابق وہ ویسا ہے جیسا اس نے اپنے آپ کو بیان کیا۔

نعت کے فروغ کے سلسلہ میں' میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس کے اسباب وعلل پر مختصر گفتگو آنے والی سطروں میں کی جائے گی۔ نعت کے فروغ کے باب میں پہلا عنصر تو

فضا کی وہ تبدیلی ہے جو ضیاء الحق مرحوم کی کاوشوں سے پیدا ہوئی۔ تقریبات اور جلسوں سے لے کر برقیاتی ذرائع ابلاغ تک نعت کو لازمی جز اور شق کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اپنے ہر دورِ ابتلا میں امتِ محمدیہ ؐ کو وہی ذات یاد آتی ہے جس کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل فرمائی اور ظلمتوں میں وہی ہستی امید کا سورج بن کر طلوع ہوتی ہے۔ قمر صاحب کی نعتوں میں اس فجرِ بشر اور نورِ مبین صلی اللہ علیہ وسلم سے شخصی تعلق اور وابستگی کا اظہار بھی ہے اور مرتبۂ رسالت سے آگاہی کا انداز بھی ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم کی ردیف میں ان کی نعت درود ہے اور اس کی نغمگی شاعر کی روح کے سازینہ کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے۔ اس نعت کے دو شعر شمائل کے زمرہ میں آتے ہیں اور پڑھنے والے کو سرمستی کا تحفہ پیش کرتے ہیں اور اس ادب گاہ کا ذکر کس انداز سے آیا ہے جس کے بارے میں عزت بخاری نے کہا تھا۔

ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید وبایزید ایں جا

شعر ملاحظہ:

روضہ اقدس قبلہ عالم' کوچہ بطحا کعبہ دوراں
گنبد خضرا' قصر نبوت' صلی اللہ علیہ وسلم

''تھی ضرورت آپ کی'' بہت شاعرانہ ردیف نہیں ہے مگر اس ردیف میں قمر صاحب کی نعت پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نعت کو اس ردیف کی ضرورت تھی کیونکہ اس سے رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے کتنے ہی پہلو سامنے آتے ہیں اور پڑھنے والا آپ کی نبوت کے ناگزیر ہونے کے کتنے ہی پہلوؤں پر غور کرنے لگتا ہے۔

ثبت ہے جس کی جبیں پر آپ ؐ کا نقشِ قدم
اس مقامِ منتہا کو تھی ضرورت آپ ؐ کی

غم تو لاکھوں تھے مگر کوئی شریکِ غم نہ تھا
ہر دلِ درد آشنا کو تھی ضرورت آپؐ کی

اور اس نعت میں رفیقانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جس طور پر آیا ہے اس سے مرا یہ ادبی عقیدہ پختہ تر ہوگیا ہے کہ سرکارِ دوجہاں کی سیرت کے نقوش ابھارنے کے لئے یارانِ مصطفیؐ کا تذکرہ ناگزیر ہے۔

مولانا قمر احمد عثمانی نے حضرت فاروق اعظمؓ پر ایک خاصی طویل نظم اور چند مختصر قومی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے ان کی وہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے جو ڈھاکہ میں قائداعظم کی آمد کے موقع پر ایک بڑے جلسہ میں پڑھی گئی۔

قوم نے مل کر جو کی تدبیر پاکستان کی
بن کے ابھری خودبخود تصویر پاکستان کی

افسوس اس وقت دوسری مصروفیات کی وجہ سے ان نظموں کا جائزہ لینے سے قاصر ہوں۔ آخر میں میں مولانا کی غزلوں کے بارے میں مختصراً کچھ کہنا چاہوں گا۔

مولانا نے غزلوں کے حصہ کا عنوان ''حرفِ تمنا'' قرار دیا ہے جو بڑی معنویت اور رمزیت رکھتا ہے اور اقبال کے شعر کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل کرتا ہے۔

فلسفہ شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

کس کے روبرو؟ محبوب کے؟ حقیقت کبریٰ کے؟ یا اپنے؟

قمر عثمانی صاحب کی غزل کے بارے میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ ان کا عشقیہ لہجہ حسرت اور جگر کے اسالیب کے درمیان سفر کرتا ہے۔ مولانا بنیادی طور پر ہمارے قدیم شعرا کی طرح غزل کو عشق وحسن کا آئینہ دار اور مظہر سمجھتے ہیں ۔آرائش خم کا کل، سرمژگاں ستاروں کا چمکنا، شب وعدہ کا ڈھلنا اور کسی کا نہ آنا(۱)۔فرطِ شوق سے کسی کے عارضوں

کا گلنار ہوجانا(۲)، شامِ غم کا ڈھلنااور درد کا سوا ہونا(۳)۔پھول کا شاخ سے سفر کرکے کسی کی زلف سیہ میں مہتاب کی طرح کھلنا، (۴) آغوشِ

(۱)ڈھل چلی شب وعدہ، انتظار اب کیسا
اب تو نیند آجائے، اب تو وہ نہیں آئے

(۲)وہ فرطِ شرم سے گلنار ہوگئے عارض
ابھی مری نگہ شوق نے کہا کیا ہے ؟

(۳)جیسے جیسے ڈھلے گی شامِ الم
دردِ دل اور بھی سوا ہوگا

(۴) گو پھول شاخ پر بھی بہت خوشنما لگے
زلفِ سیہ کی شب میں تو مہتاب سا لگے

(۵) تصور میں کسی کو آواز دینا اور فاصلوں کا سمٹ جانا۔ یہ اور ایسے کتنے ہی موضوع اور مناظر ان غزلوں میں ملتے ہیں۔فیض صاحب نے سچ کہا تھا۔

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی

اور

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوااور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

دنیالاکھ بدل جائے، انسان خلا میں سیر کرے اور اپنے سیارے کی مرمت کرے، دنیا ایک چھوٹی سی بستی بن جائے جس میں دور دراز کے ملک ہمارے پڑوس کے مکان بن جائیں مگر جب تک آدمی کا دل دھڑکتا رہے گا، لب وعارضِ کے رنگ نگاہوں کودعوتِ نظارہ دیتے رہیں گے،لبِ نازک پہ تبسم کی ہلکی سی لکیر ابھرتی رہے گی۔ یہ مضامین پرانے نہیں ہوں گے اور ہمارے دل کی دروازوں پر دستک دیتے رہیں گے۔

(۵) جب بھی آغوشِ تصور میں پکاروں اس کو
وہ میرے اور قریب‘ اور قریب آجائے

لیکن فراق صاحب کی یہ بات بھی سچ ہے کہ غزل حیات وکائنات کا آئینہ ہے (خیال ان کا ہے‘ لفظ ہمارے ہیں) انسان کا کون سا تجربہ ہے جو فارسی اور اردو غزل میں نہیں ملتا۔ میرؔ غالب اور اقبال نے تو غزل کو قدِ آدم اور قدِ عالم بنادیا ہے ۔مولانا قمر عثمانی نے بھی حدیثِ دل کے ساتھ حکایتِ روزگار بھی اپنی غزلوں میں رقم کی ہے۔

جسم بکتے ہیں برسر بازار
ختم یہ کاروبار کب ہوگا
کوئے جاناں سے داروزنداں تک
سارے رستے ہیں جانے پہچانے

مولانا قمر کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ دینی اصطلاحات اور فقہی مسائل کو بھی وہ دائرہ غزل میں لے آتے ہیں۔

زندگی بھر میرے مطلوبِ دعا تم ہی رہے
ہم نے بدلا نہیں عنوانِ مناجات کبھی
ہماری یہ کب مجال جو شیخ شہر پرجاکے معترض ہوں
’’حلالہ‘‘ کو وہ مباح کردیں‘ نکاح کو وہ حرام لکھ دیں

کہیں کہیں ان کی رمزیت زبان وبیان اور غزل کے مزاج کے امکانات کو روشن کردیتی ہے۔

وہ ایک حرف کبھی جو زباں پہ آنہ سکا
وہ ایک حرف ذرا سوچئے تو کیا ہوگا

مولانا کی غزل میں حکیمانہ نکتے بھی ملتے ہیں۔ کئی برس ہوئے پٹنہ (بہار) میں

دانش وری کے موضوع پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں یار لوگ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ دانشوری کا تقاضا افکارِ ماضی کو رد کرنا ہے۔ اس کے مقابل چند لوگوں نے کہا کہ نئے اور پرانے خیالات کو دانش اور عقل وفہم کے میزان میں تول کر قبول یا رد کرنا‘ دانش وری ہے مگر آپ جانیں کہ نعروں کے دور میں ایسی باتوں پر کون غور کرتا ہے۔ مولانا قمر نے اسی نکتے کو کس خوبی سے غزل کا شعر بنا دیا ہے۔

بات حق ہو تو کرو دل سے قبول
وہ نئی ہو کہ پرانی لوگو!

مولانا کی شاعری کی نئی اور پرانی اعلیٰ قدروں‘ خیالوں اور جذبوں کی شاعری ہے اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اوران کی آواز زیادہ سے زیادہ دلوں کو زندگی کے متنوع دائروں سے آشنا کرے۔

(طلوع/قمر احمد عثمانی، ۱۹۹۸ء، علمی کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

نزول پر ایک نظر

شفیق الدین شارق ''بزرگ'' اہل قلم کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک طرف ان اقدار حیات سے وابستہ ہیں جو ہماری شناخت رہی ہیں اور دوسری طرف وہ عہد حاضر کے ان تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں جو آج ہماری زندگی ثقافت اور ادب کو درپیش ہیں۔ ''کل کی بغاوت آج کی روایت ہے'' یہ سلسلہ ادب اور زندگی میں جاری وساری رہتا ہے اور جو لوگ اس نکتے کو سمجھ نہیں پاتے وہ زندہ اور نئی روایات کو بھی قبول نہیں کرتے اور یوں ان کا اور ان کے افکار کا رشتہ زندگی اور اس کے سرچشموں سے منقطع ہوجاتا ہے۔

شارق صاحب کے ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نظرے خوش گزرے'' ان کے بارے میں میرے پیش کردہ معروضات کی دلیل کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے اس مجموعہ کا انتساب ''اپنے بچوں سمیت نئی نسل کے نام'' کیا ہے۔ یہ مستقبل سے ان کی وابستگی کا اشارہ ہے۔ اپنے مختصر تعارف میں انہوں نے اپنے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔ وہ حضرت سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہیں۔ اس عہد میں یہ استادی شاگردی کی روایت شعروسخن کی دنیا میں کمزور پڑگئی ہے۔ کبھی ''بے استاد'' ہونے کو برا سمجھا جاتا تھا اور آج کے شاعر اس پر فخر کرتے ہیں اور اپنی ہر غلطی کو اپنا اجتہاد قرار دیتے ہیں۔

اس مختصر تنقیدی مجموعے میں دس مطالعے ہیں۔ شارق صاحب تنقید کے کسی دبستان کے پابند نہیں بلکہ ادب کو زندگی کی موج رواں سمجھتے ہوئے اسے دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔

ان مضامین میں سے دو مضمون بزرگ شعراء سے متعلق ہیں۔ ایک مضمون تو مشاعروں کے بارے میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے خطبات سے ترتیب دیا گیا ہے۔ حسن ترتیب اور انتخاب نے اسے ایک مربوط تحریر بنا دیا ہے اور دوسرا مضمون حضرت صبا اکبرآبادی کی غزل کے بارے میں ہے۔ دوسرے مضامین حامد مدنی، مشتاق احمد یوسفی، سلیم احمد، محبوب خزاں، انجم اعظمی اور بعد کی نسل کے فنکاروں کے فکروفن کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شارق صاحب آج کے ادب کے ہم قدم اپنا سفر طے کررہے ہیں۔

اب شارق صاحب کا مجموعہ حمدونعت شائع ہو رہا ہے۔ شارق صاحب ایک راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان ہیں۔ علم وعمل کی یکجائی نے ان کی شخصیت کو وحدت عطا کردی ہے۔ وہ وحدت جو انسانی زندگی کو سکون اور طمانیت کی دولت عطا کرتی ہے۔ شارق صاحب کے لئے حمدونعت ان کی روح کا تقاضا، ان کے ایمان اور جذبات کا اظہار ہے اور اس کا اجر اللہ کی محبت اور نبی اکرم ﷺ سے قربت کی صورت میں انہیں ملے گا (اور کون جانے مل چکا ہو) لیکن حمد اور نعت ادبی اصناف بھی ہیں اس لئے شارق صاحب کے حمدیہ اور نعتیہ کلام کا فکری اور ادبی جائزہ بھی لینا مناسب ہوگا۔

ان دنوں نعت کے بعد اب ہماری ادبی دنیا حمد اور اس کے جائزے کی طرف متوجہ ہوئی ہے۔ حمد کے انتخابات شائع ہو رہے ہیں اور حمد سے متعلق مجلوں اور رسالوں کے شمارے مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دور میں نعت پر تو شاعروں نے بہت توجہ دی ہے مگر حمد کے تقاضوں اور آداب سے آگاہی کا جلوہ کم نظر آتا ہے۔

یہ تاثر بنیادی طور پر درست ہے۔ اللہ تک رسائی بہت آسان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مشکل ہے۔ یہاں ''اللہ تک رسائی'' سے میری مراد اس کی ذات وصفات، اس کائنات میں اس کے جلوہ بے رنگ اور جلوہ ہم رنگ کی ''دید'' اور اسے نزدیک رگ جاں

محسوس کرنے سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی ہے کہ ہمارے رب ہم پر اپنے آپ کو اسی طرح منکشف کر جیسا تو ہے اور ہم تیرے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے جو تو نے بتادیا ہے۔ یہ معاملہ بھی عجب ہے کہ ایک طرف عقل بے بس اور حیرت وافتادگی میں غرق ہے اور دوسری طرف بچہ تتلیوں اور پھولوں کے رنگ، رنگ برنگے بادلوں اور ایسے ہی نظاروں میں تجزیہ کئے اور سمجھے بغیر اسے دیکھ لیتا ہے۔

شارق صاحب ایک طرف تو قرآن حکیم میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ اور ذکر کے دروازے سے گزر کر معرفت کی طرف بڑھے ہیں اور دوسری طرف ان میں بچے کا تحیر بھی ہے۔ وہ تحیر جو بچے کو حجابات درمیاں سے گزار کر اس بارگاہ جمال تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک طرف تو شارق صاحب ایسے مسلمان ہیں جس کا ایمان چشم وگوش کے جلووں اور عقل وخرد کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور دوسری طرف وہ قرآن حکیم کی رہنمائی میں ذات باری تعالیٰ کو محسوس کرتے ہیں، اس کے نغمہ تخلیق کو سنتے ہیں اور لالہ وگل کے استعاروں تک پہنچ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ کبھی جلوہ حجاب نظر بن جاتا ہے اور کبھی حجاب نظر جلوہ بن کر جگمگانے لگتا ہے:

ذات سو حجابوں میں اور صفات صد جلوہ
دیکھئے تو پردہ ہے، سوچئے تو جلوہ ہے

مرے دل سے ترے وجود تک، ہے فضا تمام دھنک دھنک
وہ خیال ہے ترے قرب کا کہ لہو بھی موج شمیم ہے

ان اشعار میں الفاظ کا انتخاب اور بحر کی نغمگی اس بات پر شہادت دیتی ہے کہ شارق صاحب ''اللہ جمیل'' کے نکتے سے پوری طرح باخبر ہیں اسی لئے اس کی حمد میں

جمال اور حسن کا حد درجہ اہتمام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ''جلوے'' کی صورت ہر مسلمان کی زندگی میں آتی ہے اور ہر دن اس حیرت خانہ امروز وفردا میں تسلسل اور تیقن اسی کی ذات سے ہے۔

کل یوم ھو فی شان

اور یزید فی الخلق مایشاء

آج بھی کار تخلیق جاری ہے۔ نئے ستارے اور سیارے ڈھل رہے ہیں، نئی کہکشائیں سامنے آرہی ہیں۔ تخلیق کے نئے امکانات ابھر رہے ہیں۔ دیکھئے یہ قرآنی اور علمی حقائق کس طرح ایک شعر میں سمٹ آئے ہیں:

ترے حرف تخلیق سے ہر وجود
ترے لفظ کن میں ہر امکان ہے

اور یہ امکان مسلسل ہے اور جاری رہے گا۔ جوش صاحب کا نہایت مشہور شعر ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوش صاحب کا مجموعی رویہ ذات حق تعالیٰ کے ساتھ جو کچھ بھی ہو، وہ منکر تو نہ تھے لیکن ''اگر رسول نہ ہوتے'' کے ٹکڑے سے ان کی فکر ہم پر روشن ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس کل یوم ھو فی شان سے باخبر شاعر اسی ''ثبوت'' کو یوں پیش کرتا ہے۔

اترتی ہے فلک سے صبح صادق
لئے روز اک جھلک نور خدا کی

ہر صبح ایک نئی شان اور نیا ثبوت ہے اور صبح صادق میں ''صادق'' کا ٹکڑا بڑی معنویت رکھتا ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ اتنا واضح ہے کہ کسی گفتگو اور تفصیل کی ضرورت نہیں۔

شارق صاحب کے حمدیہ کلام میں ہیئت اور اسالیب سخن کا تنوع ہے جو اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے ایک مخمس کے یہ دو مصرعے دیکھئے۔

اس کی تجلی ہر جا ہے ساکن
از عرش اعظم تا قلب مومن

حمدیہ حصہ میں کئی نظمیں بھی ہیں؛ کعبۃ اللہ، مکۃ المکرّمہ، سفر حرمین، حسرت سفر حرمین، ایک دعا۔ ان نظموں سے شاعر کے دل اور دماغ دونوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کی شاعری پورے وجود کی شاعری ہے۔ شارق صاحب کا خاص وصف اپنے جذبات پر ان کا قابو ہے جو زبان پر ان کی قدرت کے ساتھ مل کر اچھی شاعری کی تخلیق کرتا ہے۔ سفر حرمین کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

مکہ کا سفر عین عبادت کا سفر ہے
طیبہ کا سفر حق محبت کا سفر ہے

حمد کے بعد شارق صاحب کی نعتیں ہیں۔ ان میں بھی موضوع اور ہیئت کی وسعت ہے۔ شارق صاحب نے مسلمان کے کردار اور اس کی زندگی کا رشتہ بھی مدح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑ دیا ہے کیونکہ وہ مقصد بعثت سے واقف ہیں۔ میں کئی بار اپنی تحریروں میں یہ نکتہ پیش کر چکا ہوں کہ ان دنوں ہمارے ہاں عشق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت چرچا ہے ۔ ہمارے ہر گلی کوچے میں اتنے عاشقان رسول ہیں کہ ان کے شمار کے لئے ایک مستقل محکمہ درکار ہوگا۔ لیکن اتباع سنت کا ذکر شاید ہی کوئی کرتا ہو حالانکہ یہی عشق کی نشانی ہے اور اتباع رسول ﷺ اللہ سے محبت کا قرآنی معیار ہے۔ ''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا۔'' شارق صاحب کی نعتوں میں یہ نکتہ اکثر مقامات پر جگمگاتا نظر آتا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

پہلے اسے مکہ کی طرح فتح کرو
اور اس میں جو بت ہیں سب کو توڑو
دل کو تو مسلماں کرو دست حق پر
پھر عشق محمد ﷺ کا اعلان کرو

ہم اپنے قلب ونظر کے اسلام کی تکمیل سے پہلے اور اس کی اہمیت سے بے خبر رہ کر عشق محمد ﷺ کا مسلسل اعلان کر رہے ہیں۔

شارق صاحب کو نبوت محمدی ﷺ کے عملی اور اجتماعی پہلوؤں کا بھی پورا عرفان حاصل ہے۔ آج بھی ہمارے لئے اسم محمد ﷺ حصن حصین ہے۔ ہم اسی قلعہ اور اس کی فصیل میں محفوظ ہیں۔ نگہبانی تو اللہ تعالیٰ کی ہے مگر اس کا اظہار نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زندہ وجود کے حوالے سے ہوا ہے۔

ہے دین محمد ﷺ کا خدا آپ نگہبان
یہ دیں ہے چراغ تہ دامان محمد ﷺ

شارق صاحب نعت کے آداب کے ساتھ ساتھ نعت کے عناصر سے بھی خوب واقف ہیں۔ میں ان سے پوری طرح متفق ہوں کہ منقبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نعت کا حصہ ہے اور نعت میں شامل ہے۔ یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ ابوبکرؓ کو دیکھا تو وہ صدیق بن گئے اور ہرامت میں ایسا صدیق ایک ہی ہوتا ہے۔ عمرؓ کو دیکھا تو وہ فاروق بین الملتین بن گئے، عثمانؓ پر نظر ڈالی تو ان کا دل ہر دو جہاں سے بے نیاز ہوگیا، علیؓ ان کی آغوش میں آئے تو علوم کا باب اور قضا وعدل کی مثال بن گئے:

یہ بھی عشق نبی میں شامل ہے
حب اصحاب باصفا رکھئے

محترم شارق صاحب نے اپنی نعتوں کے لئے روشنی آیات قرآنی سے حاصل کی

ہے۔ ورفعنا لک ذکرک. اکملت لکم دینکم اور دوسرے قرآنی ٹکڑوں کی کہکشاں ان کی نعتوں کو جگمگا رہی ہے۔ یہ رنگ ہمارے دور میں جناب عبدالعزیز خالد اور حضرت حفیظ تائب کے ہاں بھی شعر بن کر چمکا ہے ۔شارق صاحب کے مزاج اور افتادِطبع کو بھی قرآن حکیم سے ایسی وابستگی ہے کہ الفاظ قرآنی کی قندیل ان کے اشعار کو منور کررہی ہے۔

جناب شفیق الدین شارق کے اس مجموعہ نعت سے ہمارے دلوں کی دھڑکنوں کو حب رسول اللہ ﷺ کا آہنگ حاصل ہوتا ہے۔ آنکھوں کے آنسوؤں میں حرم کعبہ اور حرم نبوی کے عکس جھلملانے لگتے ہیں اور ہم اپنے اندر محبت کی چنگاری کو روشن تر دیکھتے ہیں۔

یہ چند سطریں ازراہ حصول سعادت لکھی گئی ہیں ورنہ سچ یہ ہے کہ میں شارق صاحب کی نعت گوئی سے انصاف نہیں کرسکا ہوں۔

(نزول/شفیق الدین شارق، ۱۹۹۹ء، اقلیم نعت، کراچی)

ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری...... ایک تاثر

الحمدلله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وامام المتقين محمد وآله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين۔

اس وقت صبح کے چار بجے ہیں۔ فجر کا وقت ابھی ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ نہ جانے نیند کا طائر میری آنکھوں کے نشیمن سے ناراض کیوں ہوگیا۔ تجزیہ کیا تو خود پر یہ بات کھلی کہ ہشام علی حافظ کے نعتیہ دیوان ''احبک ......احبک ۔ یاحبیبی صلی اللہ علیہ وسلم یا رسول اللہ پر اپنے تاثرات قلم بند کرنے ہیں۔ پچھلے دنوں بیمار رہا اور اسی عالم میں اصل دیوان کا مطالعہ کیا' ترجمہ کو پڑھا اور دونوں کا تقابل کیا۔ اس کام میں تاخیر ہوئی......تاخیر کی وجہ صرف میری علالت نہیں تھی بلکہ حقیقی سبب یہ تھا کہ میں حقیقی اور سچے ادب' بالخصوص شاعری کو تیزی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا۔ اکثر میں کتاب پڑھتے ہوئے مصنف کی آواز سنتا ہوں کہ مجھ سے آسان نہ گزرو' میری کتاب کے صفحات میں مجھے تلاش کرو اور مجھے دیکھو' یہی لفظ میرے حقیقی خدوخال ہیں۔ اچھی کتاب کے مطالعے کے دوران ایسے مقامات آتے ہیں کہ میں کتاب کو بند کرکے سوچنے لگتا ہوں اور جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اچھے شعر اور مصرعے مجھے نہ جانے کن دنیاؤں اور فضاؤں میں پہنچا دیتے ہیں۔ اچھی شاعری ایک چہار سمتی مکالمہ ہوتی ہے۔ شاعر کا مکالمہ اپنی ذات کے ساتھ' اپنے رب کے ساتھ' اس کائنات کے ساتھ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ۔

نعتیہ شاعری میرے نزدیک مشکل ترین صنفِ سخن ہے اور بالخصوص جب شاعر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب بھی ہوتا ہو۔ ذرا سی بے احتیاطی حبطِ اعمال کا سبب بن سکتی ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر عرفی شیرازی نے کہا تھا کہ نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنے کی طرح ہے۔ میں دیر تک ہشام علی حافظ کے نعتیہ دیوان پر مواجہ شریف کے نقش کو دیکھتا رہا اور کتاب کے نام پر میری نظریں جمی رہیں۔ جب بھی میں نے اس کتاب کو اٹھایا میرے لب کتاب کے نام کو دہراتے رہے اور آنکھیں مواجہ شریف کو دیکھتی رہیں۔

احبک احبک احبک

یاحبیبی، یارسول اللہ

مجھے تم سے محبت ہے...... مجھے تم سے محبت ہے...... مجھے تم سے محبت ہے

یاحبیبی، یارسول اللہ

یہ نام محض کتاب کا نام نہیں، بلکہ ایک سرگوشی ہے......سارے وجود کی سرگوشی...... ایک فغانِ زیرلب ہے جو ہونٹوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلتی۔ یہاں ''یا'' کے استعمال میں استمداد اور استعانت نہیں بلکہ ایک اُمتی کا تخاطب ہے جو اپنے دل کی گہرائیوں میں اس ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کو موجود پاتا ہے۔ وہ ذات جو اساس ایمان ہے اور آج بھی ہر اُمتی کے لئے حاضر بھی ہے اور غائب بھی ......نظروں سے غائب مگر فکروشعور وآگہی میں سب سے توانا قوت کی طرح موجود۔

اور پھر اس نکتے پر تو غور کیجئے کہ شاعر وہ ہے جس نے مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آنکھیں کھولیں، اپنا بچپن گزارااور عمر کی کئی منزلیں طے کیں، جس کے سجدوں کو مسجد نبوی کے فرش نے مہرِ محبت کی طرح قبول کیااور جس کے آنسوؤں کی چمک نے فرش کو اور روشن کردیا، جس نے مدینہ منورہ کی کھجوروں سے شیریں سخنی حاصل کی اور وہاں کے پانی سے اپنے وجود کو سیراب کیا۔

''میں چھوٹا تھا
نادان، ناسمجھ تھا
جوار نبی ﷺ میں رہتا تھا
اس مٹی پر چلتا تھا
جس نے رسول اللہ کے قدموں کے بوسے لئے تھے
اس درخت کی کھجوریں کھاتا تھا
جس سے ابوبکرؓ وعمرؓ نے کھائی تھیں
اس چشمے کا پانی پیتا تھا
جس سے امام المتقین نے پیا تھا
میں رہ رہا تھا
اللہ کے محبوب ترین شہر میں''

یہ مصرے اس مجموعے کی دوسری نظم سے لئے گئے ہیں جس کا عنوان ہے ''لی ابن مثلک اسمہٗ محمد''

محمد لئیق اللہ خان صاحب نے اس عنوان کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ''تمہارا ہی ہم نام میرا بھی ایک بیٹا محمد ہے۔''

بیشک مدینہ منورہ اللہ کا محبوب ترین شہر ہے، فضائل مدینہ کا باب ہر معتبر مجموعہ احادیث میں موجود ہے اور فضائل مدینہ کی احادیث دکتور صالح بن حامد بن سعید الرفاعی نے بڑے عالمانہ انداز میں اپنی تحقیقی کتاب میں جمع کردی ہیں۔ اردو میں بھی اس موضوع پر کئی کتابیں موجود ہیں۔ یہ شہر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حرم ہے، یہ وہ شہر ہے جس میں دجال داخل نہ ہوسکے گا، یہ وہ شہر ہے جس کی سکونت انسانوں کے لئے انعام الٰہی ہے۔ مدینہ ''حسنہ'' ہے ''قبۃ الاسلام'' ہے۔ ''سیدۃ البلدان'' ہے، ''طاہر'' ہے اور

''طیبہ'' ہے۔ فضائل مدینہ کے بیان کے لئے دفتر درکار ہے۔

ہشام علی حافظ کا مدینہ منورہ میں پیدا ہونا اور اس شہر سے ان کا ہمہ جہتی رشتہ اتفاق نہیں۔ اللہ کی اس کارگاہ عظیم میں کوئی چیز اتفاق نہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی شے اس کی مسلسل منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔ ہشام علی حافظ کا نام مدینہ کی نسبت سے میرے ذہن کی الجھن اور اکساہٹ بن گیا پھر اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور میں نے اپنے بیٹے سید ابواحمد عاکف سے پوچھا کہ کیا ہمارے کتب خانے میں مدینہ کی تاریخ پر کوئی انگریزی کتاب موجود ہے ؟ عاکف سلمہ نے کہا ''جی ہاں'' اور وہ علی حافظ کی کتاب لے آئے۔ ''CHAPTERS FROM THE HISTORY OF MADINA'' اب سوال یہ تھا کہ ہشام علی حافظ اور علی حافظ کا حقیقی رشتہ کیا ہے؟ سوال کا جواب کتاب کے تعارف میں مل گیا۔ ہشام مورخ مدینہ کے صاحب زادے ہیں۔ الولد سر ابیہ۔

ویسے تو ہشام علی حافظ کا نعتیہ دیوان مختلف نظموں کا مجموعہ ہے مگر میں اسے ایک طویل نظم سمجھتا ہوں ممکن ہے کہ شاعر یا پڑھنے والے مجھ سے اتفاق نہ کریں لیکن مجھے تمام اجزاء (جنہیں مجھ سے اتفاق نہ کرنے والے مختلف نظمیں قرار دیں گے) کے درمیان ایک وحدت نظر آئی ہے۔ مختلف پہلوؤں اور تناظر میں انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء خوانی کی ہے۔ ان سب اجزاء کا معنوی ربط اس دیوان کو ایک نظم بنا دیتا ہے۔ اس میں ایک میورل (MURAL) یا بسیط دیواری تصویر کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ کاغذ اور الفاظ کی وسعتوں کا کوئی ٹھکانا ہے؟ شاعری تصویر بھی ہے' نغمہ بھی' تاریخ بھی ہے اور تخیل نامہ بھی۔

نظم کا پہلا حصہ ''قصہ ازواج الطاہرۃ بالامین'' سب سے طویل ہے۔ اس میں صاحب معراج صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے کتنے ہی نقوش سمٹ آئے ہیں اور پھر سمندر کی موجوں کی طرح مختلف اجزاء ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ رہی کتاب کی

ترتیب' سو وہ شاعر کے ذوق' مزاج اور فنی تقاضوں کے مطابق ہے۔ وہ کبھی عہد حاضر میں لوٹ آتا ہے' سمندر کے کنارے ننھے محمد سے ملاقات' اپنی بیٹی کی پیاری تحریریں' عہد حاضر میں اسلام کی اجنبیت اور پھر شاعر خیر القرون کی طرف لوٹتا ہے۔ سرور کائنات اور رسول آفاق صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر گرامی ہمارے لئے زمان ومکاں کو سمیٹ لیتا ہے۔ یہ صاحبِ معراج صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی کرامت اور اعجاز ہے۔

وزن' قافیہ' ردیف یہ شاعری کا خارج ہے۔ نظم معریٰ' نظم آزاد اور اب نثری نظم (اور اردو میں ہائکو اور واکا کی کامیابی سے یہ حقیقت ایک بار پھر ہمارے سامنے آتی ہے کہ شاعری کی اساس اور بنیاد تخیل ہے۔ اگر شاعری میں تخیل نہ ہو تو شاعری کاری گری کی سطح سے آگے نہیں بڑھتی۔) پھر شاعر کے لئے مشاہدہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جس نے اپنے رب کی آیات' انسانی فطرت اور معاملات حیات وکائنات کو گہرائیوں میں جاکر دیکھا ہو اور جو نفس انسانی کی بوقلمونی سے واقف ہو وہی مملکت شعر کی شہریت حاصل کرسکتا ہے۔ مشاہدہ کے بعد مطالعہ آج شعر کا بنیادی عنصر ہے' بالخصوص نعتیہ اور تاریخی پس منظر سے تعلق رکھنے والی شاعری کے لئے یہ بات اور اہم ہوجاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ زبان پر قدرت شاعری کی ایک اور بنیادی شرط ہے۔ لفظ تو شاعر کا وسیلۂ اظہار ہیں۔ مفاہیم ومطالب کے طلسم کدے کا دروازہ لفظ کی کلید سے کھلتا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

نعتیہ شاعری کے لئے ان کے سوا کچھ اور شرائط ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ دل ونگاہ مسلمان ہوں اور دوسری شرط یہ کہ شاعر نے قرآن عظیم کا گہرا مطالعہ کیا ہو' کیونکہ قرآن مجید ہی سے ہمیں قرآن ناطق صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ''شاہد' مبشر' بشیر' نذیر' صاحب خلق عظیم' صاحب کوثر' داعی الی اللہ' نور' سراج منیر' مزمل' مدثر

اور ہادی' یہ ان کے مقام عظیم کی چند منزلیں ہیں۔ ہشام علی حافظ بڑی حد تک نعتیہ شاعری کی ان سب شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ بالخصوص ان کے تخیل میں بڑی قوت ہے۔ وہ بہت سے نازک مقامات سے بڑی کامیابی سے گزرے ہیں' بالخصوص حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر' اس موقع پر حضرت آمنہ کی کیفیات' حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے جذبات کی عکاسی۔ کم ہی شاعر اور لکھنے والے ان مرحلوں سے بامراد اور کامیاب گزرتے ہیں۔ میں اختصار کے پیش ذکر مثالوں سے گریز کررہا ہوں مگر حضرت خدیجہؓ کے خواب کے بیان سے متعلق یہ چند سطریں ملاحظہ ہوں......

خدیجہؓ نے دیکھا
درخشاں آفتاب
گھر کے صحن میں اُترا ہوا ہے
سارے ماحول کو چکاچوند کئے ہوئے ہے
اس کی ضیاپاشیوں سے مشرق ومغرب
دنیا کا ذرہ ذرہ
صدطور بن رہا ہے

شاعری کا ترجمہ بہت مشکل بلکہ ناممکن عمل سمجھا جاتا ہے لیکن ہرزبان کو ایسے مترجم مل ہی جاتے ہیں جو ترجمے کے ذریعے اپنی زبان کی آب وتاب میں اضافہ کرتے ہیں۔ محمد لئیق اللہ خاں صاحب نے بڑی حد تک اس نعتیہ مجموعہ کے ترجمے کا حق ادا کردیا ہے۔ کتاب کے بڑے حصے میں انہوں نے شاعرانہ آہنگ اور فضا کو برقرار رکھا ہے لیکن میں یہ بات سمجھنے سے قاصر رہا کہ انہوں نے ''یاحبیبیﷺ یا رسول اللہ'' کو برقرار کیوں نہیں رکھا۔ یہ کلمات اردو زبان کا حصہ ہیں اور اس نظم کے صوتی آہنگ کا انحصار (بڑی حد تک)

ان کلمات کی تکرار پر ہے اور اسی طرح عربی نظم کے بعض اور ٹکڑے اردو ترجمے میں برقرار رکھے جاسکتے تھے۔

یانبی اللہ یا رسول اللہ
افضل من الدنیا ومافیھا
یاحبیب اللہ یا محمد
یاحبیب اللہ یا محمد
نصلی ونسلم علیک

ہماری نعتیہ شاعری میں ایسے عربی فقرے اور اظہار عام ہیں۔ مجموعی طور پر ترجمہ اصل سے ''وفاداری'' کی عمدہ مثال اور اردو محاورے کے عین مطابق ہے اور مجھے یقین ہے کہ اردو دنیا اس نعتیہ مجموعے کا خیر مقدم کرے گی اور اس کے مطالعہ سے دلوں میں عشق محمدیﷺ کی مشعل فروزاں تر ہوگی۔

ہشام علی حافظ نے اپنی بیٹی آمنہ سے کہا ہے کہ......

میں وہ سارے لفظ تیری نذر کرتا ہوں
جو ترجمانی کرتے ہیں
پیار کی' محبت کی

میرے عزیز شاعر اور محترم اسلامی بھائی! آپ کے لئے میں آپ ہی کے الفاظ دہراتا ہوں......اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں آپ کو سرفراز فرمائے' آپ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے میں دیارشب سے سواد فجر تک آ گیا۔ لیجئے' فجر کی پہلی اذان فضا میں بلند ہو رہی ہے......موذن اللہ کی وحدت اور محمدﷺ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے اور اب وہ کہنے ہی والا ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم' اذان فجر کے بارے میں محمد اقبال نے کیا خوب کہا ہے......

وہ سحر جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

اب میں اپنی اس تحریر کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آج رات آپ کی شاعری نے مجھے غفلت سے دور رکھا اور میں آپ کے دل کی دھڑکنیں سنتا رہااور میں نے اپنے آپ کو روحانی طور پر ادب واحترام اور دیدۂ پرنم کے ساتھ مواجہ شریف میں کھڑے ہوئے پایا۔

(محبوب آقاؐ/ ہشام علی حافظ،۱۹۹۹ء،فضلی سنز، کراچی)

امین راحت چغتائی کی نعت گوئی

اس مسافر کی صدیوں سے جاگتی آنکھوں میں کتنی وادیوں اور کتنے قریوں کے مناظر آباد ہیں۔ ہر منظر روشن ہر دید اجلی۔ اور ان منظروں کے ساتھ ساتھ کتنے ہی چہرے کتنے ہی کردار کتنے مقام۔ بومیری باک کا وہ درخت جس کے سفید پھول اپنے افق کی تخلیق خود کرتے ہوئے ستارہ وار دیکھنے والوں سے چشمک زنی کرتے ہیں اور اسے ہجر ووصل کے مفاہیم سے آشنا کرتے ہیں۔

یہ مسافر امین راحت چغتائی ہے جس کا نام اس کی سعادتوں کا اشاریہ ہے۔ بعثت سے پہلے ہمارے سرورِ جاںﷺ کو ان کے معاشرے نے امین و صادق کہا۔ ان پر جو حقائق منکشف کئے گئے اور اہل زمین سے ان کا جو معاملہ رہا اس نے انہیں الامین کے درجہ پر فائز کیا۔ ہمارے چغتائی صاحب اس ذات گرامی (ﷺ) کی محبت کے امین ہیں اور اس ذات کی صفات اُن پر بقدرِ ظرف منکشف کی گئی ہیں، اور اس کا اندازہ ہم میں سے کون لگاسکتا ہے کہ رسول کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کی وسعتیں کیا ہوں گی...... اور پھر راحت۔ جس رسول مرحمت کے سائے میں اقوام عالم کو تاابد رحمت عطا کی گئی، اس کا نام نامی اپنے محبّ کے سر پر سائبان کی طرح سایہ فگن رہتا ہے۔ میری بات کی صداقت کا اندازہ آپ کو امین راحت چغتائی کے چہرے کے نقوش روشن پیشانی، ہونٹوں کے تبسم اور لہجے کی غنچہ صفتی سے ہوسکتا ہے۔ خاصانِ محمد اس ہجوم پیکراں میں سب سے الگ نظر آتے ہیں اور پہنچانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ مجھے بھی ارباب حضوری

میں شامل کردیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اور اُن سے مل کر جمیل نقوی مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

میں بھی من جملہ اربابِ حضوری ہوں جمیلؔ
میری خاصانِ محمد ﷺ سے شناسائی ہے

یہ خاصانِ محمد ﷺ عجب انداز میں ہماری زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں، بلکہ اُن کی ایک جھلک ہمارے وجود کی کیمیا کو بدل دیتی ہے۔......کبھی اُن کا کوئی نمائندہ ہمیں صفہ پر تلاوت میں گم نظر آتا ہے، کبھی اُن میں سے کوئی گنبدِ خضریٰ کے پیغام اور فیضان کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے مل جاتا ہے، کبھی خاصانِ محمد ﷺ میں سے کوئی، کسی ہجوم میں چپکے سے آپ کے پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے، کبھی کوئی اشارے پر آپ کو محمد ﷺ اور اصحاب محمد رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں کوئی کتاب بھیج کر آپ کو "خوش اوقات" بناتا ہے۔

خاصانِ محمد ﷺ اپنے آپ کو چھپاتے ہیں، لیکن اُن کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جاتے ہیں کہ حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتو ہمارے معاشرے میں اندھیرا بڑھ جائے اور ہمیں یہ موقع نہ مل جائے کہ ہم اُن کے جلووں کی مدد سے زندگی کی شب تاریک سحر کرسکیں۔ یہ لوگ ہیں جو سرورِ کائنات اور وجہ تخلیق کائنات ﷺ کے قدموں کے ذرات کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھتے ہیں اور چاندنی رات میں جب پھیلی ہوئی دنیا اپنی وسعتوں کا اعلان کرے تو کسی کا دامانِ کرم صحرا کی وسعتوں پر چھا جائے۔ صحرا کی بے کرانی کا اندازہ کئے بغیر بہت سے حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ انہیں وسعتوں میں آدمی کو آسمان اپنے سے قریب تر نظر آتا ہے، زمین کے سینے سے ابھرنے والی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ریت کے ذرات اس کے نقوش قدم کی تابانیوں کا اشارہ بن جاتے ہیں جس نے صحرائے وجود کو گلستان بنایا۔ میں نے چاندنی راتوں میں صحراؤں کی

بہار سامانی اور نظر افروزی کو دیکھا ہے اور اس منظر کے آئینے میں اس ذات کے وجود کا احساس قوی تر بن گیا ہے جس کا کرم اور رحمت بن کر گنگا سے ٹیکس تک برسا ہے، جو آج بھی ہر اہل ایمان کے دل کی دھڑکن ہے، جس کے وجود پاک سے ہمیں اور ہماری ذات کو معنویت عطا کرنے والی شاید آرزو آگئی ہے۔ امین راحت چغتائی کے دو شعروں میں مجھے اپنے کتنے ہی شب و روز کی تجسیم نظر آئی ہے۔ اُن کی بیشتر نعتیں، غزل کے پیکر میں لکھی گئی ہیں۔ مگر ان غزلیہ نعتوں کا تسلسل اُن کی شخصیت کی وحدت کی علامت ہے۔ ایک نعت مسلسل کے یہ دو شعر اُن کی زندگی کی تمنا کا آئینہ ہیں۔ "تمنا کی جگہ تمناؤں" کا لفظ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، مگر اس نعت کی ساری تمنائیں ایک ہی تمنا کے پہلو ہیں۔

تیرے قدموں کے بھی ذرات ہیں آئینہ بدست
کاش اس آئینے میں اپنا سراپا دیکھوں
یاد آئے ترے دامانِ کرم کی وسعت
چاندنی رات میں جب دامنِ صحرا دیکھوں

وہ ذاتِ گرامی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے جن کا اسم گرامی ہی ہمارے لئے وظیفہ تسکین دل و جاں ہے۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں کسی بنی کا نام معجزہِ الٰہی کے درجہ پر فائز نظر نہیں آتا۔ "محمد ﷺ" یہ ایک لفظ کامل ترین ثنا اور نعت ہے...... بیسویں صدی کے پہلے دوعشروں تک "نگرام" کی چھوٹی سی بستی صلحاء علما کے وجود سے روشن تھی۔ انہیں میں جواں مرگ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بھی تھے جنھوں نے اسم پاک محمدؐ پر نہایت خوبصورت ایمان افروز اور فکر انگیز مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون تفسیر ماجدی میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور یوں رسول اکرم ﷺ کے ایک چاہنے والے اور جاں نثار کا نام محفوظ ہوگیا ہے۔ مولانا نگرامی نے لکھا کہ "من جملہ دیگر کمالات و معجزات رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضورؐ اقدس کا نام نامی بھی ہے"...... محمد وہ ہے جو موجب

توصیف ہو، مجموعہ خوبی ہو اور جس سے زیادہ تکمیل و کمال آدمیت اخلاق کا کوئی اور نمونہ اور نمائندہ نہ ہو اور جس کا حق پورا کردیا گیا ہو...... ذرا غور کیجئے تو اسم محمد ﷺ ختم نبوت کی دلیل بھی ہے۔ جب اخلاق و کمالات کسی ذات میں اپنی انتہائی تکمیل تک پہنچ جائیں تو نبوت کے ادارے کا مقطع وہی ذات ہوگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مخلوق کامل تھے۔ ذات و شخصیت اور نام کی یہ کامل ہم آہنگی پہلی اور آخری بار حضور ﷺ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ایک بار پھر مولانا نگرامی کے الفاظ حوالے کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

" نوع انساں کو جس سرحدِ کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق تخلیق مقرر تھا وہ محمد ﷺ پر پورا کردیا گیا۔"

امین راحت چغتائی کی نعتوں میں اسم محمد ﷺ کے یہ نکات نظر آتے ہیں۔ علم جب وجدان کی مدد سے جذبہ بن جائے اور دل کی دھڑکن بن جائے تو دوسروں کے راستے روشن ہوجاتے ہیں۔ عقل تجزیہ کے عمل سے درجہ بدرجہ جس نتیجے تک پہنچتی ہے، وجدان کسی لمحہ مقررہ میں اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اقبال کے الفاظ میں " دانش نورانی" کہہ لیں۔ اس نور مجسم کے فیضان کی فصاحت کے عکس نے اس دانش نورانی کے اظہار کے لئے انہیں اسالیب اور الفاظ بھی عطا کردیئے ہیں، ورنہ روحانی تجربے کا اظہار ابلاغ و اظہار کی دنیا کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ جذبات ادیب و شاعر کی گرفت میں آجاتے ہیں اور یوں کہ شاعر کا اظہار ہمارا اظہار اور تجربہ بن جاتی ہے۔ فکر کا ابلاغ نسبتاً آسان ہے لیکن روحانی تجربہ ادھر کے اشارے کے بغیر کاغذ پر الفاظ کی صورت میں نہیں ڈھلتا...... ایسے تجربے ہماری خارجی زندگی کے سیاق و سباق کا احاطہ بھی کرلیتے ہیں اور یوں ذات کا نہاں خانہ خارجی کائنات کی وسعتوں میں اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس حوالے سے اسم محمد ﷺ کے اطراف و جوانب اور پھیلاؤ کو

امین راحت چغتائی کے ان شعروں میں ملاحظہ کیجیے:

مہک پھیلی ہوئی ہے ہر طرف اسم محمدؐ کی
جہاں ہوتی نہیں پت جھڑ، میں اُس گلزار میں آیا
محمد نام نامی لکھتا جاؤں، چومتا جاؤں
بہ ایں صورت میں اپنے درد دل کی داستاں لکھوں

تیرے ہی نام سے مجھے فکر سخن ملے
تیرا ہی نام نعت کے الفاظ میں ڈھلے

اسم محمد خود ہی بے خزاں گلزار ہے، یا پھر اسلام گلزار محمدی ﷺ ہے اور ہمارے صاحب کے نام کی برکت سے یہ گلزار، خزاں ناآشنا ہے، اس باغ کا ہر پھول اس کے حسن و جمال کے ایک نئے رخ اور پہلو کو پیش کرتا ہے جو خالق جمال کا شاہکار تھا...... " گلزار" کے اشاروں کی معنویت بڑی پہلودار ہے...... پھر " ہر طرف" کے امکانات پر غور کیجئے۔ اس میں ہر مکاں اور ہر زمانہ سمٹ آیا ہے۔ اس نام نے زماں میں بھی سفر کیا ہے اور مکاں میں بھی...... دوسرے شعر میں اسم محمد ﷺ کو ہر درد کا درماں کہہ کر بات کو محدود نہیں کیا ہے بلکہ اسے اپنا درد دل قرار دیا ہے۔ یہ درد انسانیت کے مسائل و مصائب اور مشکلات کو اپنا غم بنالینے کا نام ہے۔ یہ ہماری ذات کی توسیع ہے اور سرور کائنات کی شب بیداری اور ان آنسوؤں کی وراثت ہے جو کافروں کے لئے ہدایت اور ایمان کی دعاؤں کے دوران آپ کی آنکھوں سے اپنا سفر شروع کرتے اور رخسار مبارک کی تابانیوں سے نئ تابانی حاصل کرتے اور آج بھی زمانے کے دامن پر چمک رہے ہیں۔

یہی نام فکر کا سرچشمہ اور جذبہ کے طلوع ہونے کا مطلع ہے اور یہی نام " نعت کے الفاظ" کی ٹکسال ہے، یہی نام کارگہ فکر ہے اور اس میں ڈھلنے والا ہر ستارہ ہمارے

مقدر کی سمت کا اشارہ ہے۔ محمدﷺ اور اسم محمدﷺ کے کمالات چودہ صدیوں میں وقت کے انقلابات کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ یہ وہ پھول ہے جس کا کھلنا جاری ہے۔ ہر پنکھڑی کے کھلنے کے ساتھ صلِ اللہ کی آواز چٹک کا اعلان بن کر کانوں سے قلب تک کا سفر کرتی ہے...... اُس ذات کی مدح و ثنا کا سلسلہ جاری ہے، اپنوں کے دل اور غیروں کے ذہن اور فکر اعترافِ عظمت سرور کائنات میں مصروف ہیں۔

" اس حیثیت سے نام مبارک محمدﷺ کا ترجمہ سلسلہ اوصاف و محامد ہوگا۔"(مولانا نگرامی)

اس سلسلہ اوصاف و محامد نبی کریمﷺ کے لئے دعاؤں مقام محمود کے ذکر اور ان سے اپنی نسبت کے اظہار کا نام صلوٰۃ وسلام اور درود ہے...... یہ واحد عمل ہے جو اہل ایمان کو اللہ اور فرشتوں کا ہم کار بنادیتا ہے۔ امین چغتائی میں درود کے کتنے ہی رنگ ہیں۔ کہیں تکریم کا رنگ ہے، کہیں مدح و ثنا کا آہنگ، کہیں علوئے مرتبہ، محمدیﷺ کی دعا اور تمنا، کہیں برکت و رحمت کا نغمہ، کہیں وہ صدائے سینہ سوز جو حریم ناز میں گونجتی ہے اور جس کے لئے جبرئیل امین بھی گوش برآواز نظر آتے ہیں، کہیں صلوٰۃ و سلام میں محمد عربی علیہ الصلوٰۃ السلام کی عظمت کے نشان نظر آتے ہیں۔ کہیں لبوں پر دائرے بناتے ہوئے صلوٰۃ و سلام کے الفاظ اذن حضوری کی استدعا بن جاتے ہیں۔ اور درود تو وہ جادواں پھول ہیں جن سے امین راحت چغتائی کا گلستانِ تمنا مہک رہا ہے:

کچھ درودوں کی صدائیں تھیں حریم ناز میں
اور جبریل امیں بھی گوش بر آواز تھا

درودوں کی مہک پھیلی ہوئی ہے عرش اعظم تک
مرے آقا کی عظمت کا نشاں، دیکھو! کہاں تک ہے

منتظر کب سے ہوں سوغات درودوں کی لئے
اب مجھے اذن حضوری مرے آقا! ہوجائے

ہر گوشے میں پھول ان کے درودوں کے کھلے ہیں
دیکھے تو سہی، کوئی گلستان تمنا

نعتوں میں یہ درود و سلام مجھے تو قرآنی حکم کی تعمیل کی صورت میں نظر آتے ہیں یا ایھاالذین امنو صلوا علیه و سلمو اتسلیما عملی، لسانی، فکری اور جذباتی پہلوؤں پر محیط تعمیل ...... وہ تعمیل جس میں پورا وجود شامل ہو...... پورے وجود کی شرکت کے بغیر ایمان اور اسلام کی تکمیل نہیں ہوتی۔ " اے اہل ایمان! اسلام میں پورے داخل ہوجاؤ۔"

امین راحت چغتائی کے ہاں بیشتر مقامات پر درود کا لفظ صیغۂ جمع میں آیا ہے۔ درود کی تکرار سے وہ پل تعمیر ہوتا ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔ کسی اہل دل کی یہ بات مجھے اکثر یاد آتی ہے کہ ہر صاحب ایمان کے دل کا تار قلب محمدیﷺ سے جڑا ہوتا ہے اور " اگر یہ تار ٹوٹ جائے تو آدمی مرتد ہوجاتا ہے۔ اس تار کی مضبوطی اور استواری کا نسخہ یہی ہے کہ لب پہ درود وسلام ہو، دل میں درود و سلام ہو۔"

امین راحت چغتائی کی نعت اسی حقیقت کا فنی اور فکری مرقع ہے...... ایسا مرقع جس میں آواز نظارہ بن جاتی ہے اور منظر آواز کی صورت سنائی دیتا ہے۔

صلوٰۃ و درود کے فضائل پر کتنی ہی کتابیں مرتب ہوچکی ہیں۔ ہمارے اسلاف کے دور سے لے کر ہمارے عہد تک ...... احادیث کے مجموعوں میں اس سلسلہ میں مستقل ابواب موجود ہیں۔ ہر پڑھا لکھا مسلمان درود کے فضائل سے واقف ہے اور جو خواندہ نہیں ہیں ان کے صحیفۂ قلب پر ان فضائل کو رب محمدﷺ نے رقم کردیا ہے۔ خوش بخت ہیں چغتائی صاحب کہ درود وسلام کے لئے اُن کے دل اور ذہن کو رب العزت نے ایسی

کشا عطا کی ہے جو آج کی نعتیہ شاعری میں کم ہی نظر آتی ہے۔ درود وصلوٰۃ کے وہ الفاظ جو ہمیں بارگاہ مصطفویٰ ﷺ سے عطا ہوئے ہیں اُن کے برگزیدہ ہونے میں کون شک کرسکتا ہے؟ ان کی فضیلت مسلّم اُن کے ورد سے ہماری شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے امتی اور بالخصوص شاعر و ادیب اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور جوہر کو اپنے آقا کے اوپر نثار کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ سرور کائنات کی عظمتوں اور مرتبہ عالی کے کسی ایک گوشے کی جھلک بھی پیش نہیں کرسکتے لیکن دل زندہ اور ذہن تابندہ تو اظہار کے بہانے مانگتا ہے اور اُس کے ذکر کی تمنا سے بڑھ کر اور کیا چیز محرک بن سکتی ہے جس کا نام نامی ہی ثنا اور مدح ہو۔

حضور ﷺ کے کتنے ہی صفاتی نام قرآن حکیم اور احادیث میں موجود ہیں اور یہ نام مستقل نعتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ حاشر، عاقب، شاہد، مبشر، نذیر، نور، مزمل، مدثر وغیرہ۔ ان ناموں کے معانی و مفاہیم کو بہت تفصیل سے ہمارے اہل قلم پیش کرچکے ہیں اور ان کے معانی کے نئے گوشے مسلسل سامنے آرہے ہیں۔ ان ناموں کے علاوہ ہمارے تخلیقی ذہنوں میں نئے نام ابھر رہے ہیں۔ امین راحت چغتائی کے ذہن میں ایک ترکیب ابھری جو نام بھی ہے اور تصویر بھی۔

تصویر مرتبہ رسالت کی تصویر مقام محمدی ﷺ کی تصویر اس ربطہ کی جو خالق اور مخلوق کامل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے درمیان ہے۔ اس نعتیہ مجموعہ کا پہلا نغمہ یا مکمل سازینہ ہے محراب توحید ...... یہی اس مجموعہ کا نام ہے۔ اس امت کو اس محراب کے نیچے توحید کا گوہر یک دانہ ملا ہے۔ اسی محراب رسالت میں ہم سجدۂ عبدیت اپنے خالق کے حضور پیش کرتے ہیں۔ اس مقام پر اپنا سر اپنے خالق کے سامنے جھکاتے ہوئے ہم اپنے آقا کے لئے اس مقام محمود کی دعا کرتے ہیں جو ان کے لئے مقدر ہوچکا ہے۔

امین راحت چغتائی نے اس سے پہلے جو کچھ لکھا وہ ثنائے خواجہ کے لئے تمہید

تھی۔ لفظوں کو صرف کرنے کا سلیقہ انہوں نے اللہ سے اسی لئے طلب کیا کہ مدح سرکار کی راہیں سہل ہوسکیں۔ کم و بیش انہوں نے شعر و سخن کی وادی میں زندگی کے پچاس برس گزارے ہیں۔ اس طویل مدت میں انہوں نے الفاظ کو مسخر کیا اپنے لہجے کو تراشا، موضوع اور اسلوب کو ہم آہنگ کر کے اپنی انفرادیت کو ابھارا اور یوں وہ مدحت سرکار مدینہ کا حق ادا کرنے کے لئے عملی اور فنی طور پر مصروف رہے۔ اس سے اہم یہ بات ہے کہ مالک حرف ونوا سے انہوں نے تاب گویائی کی دعائیں کیں اور سردار اعظم ﷺ سے ہنر اور جمال فن کی بھیک مانگی۔ یوں اُن کا کشکول گدائی، خزینۂ اسلوب بن گیا ؎

دے ہُنر کی بھیک ہُنروَرا
کہ جمالِ فن مرا کم نہ ہو
میں تو آنسوؤں سے وضو کروں
تری نعت پھر بھی رقم نہ ہو

اس سلسلے میں انہیں کیا کچھ دربار رسالت سے ملا، اس کا اندازہ قارئین کرام ان کے مجموعے کے مطالعہ سے کرسکیں گے۔ انہوں نے زندگی، کائنات، تاریخ اور جغرافیہ کو مدحت سرکار کا حصہ بنادیا۔ اپنے پڑھنے والوں کو نواحِ کاظمہ میں پہنچادیا اور ریگ کے ذروں کو آئینہ ثنا بنادیا۔

مدینہ منورہ کا ذکر ہماری نعت کے مرکزی موضوعات میں شامل ہے۔ اب بیشتر شعرا کے ہاں یہ ذکر روایتی بن کر رہ گیا ہے، حالانکہ زندہ ادبی روایت باز آفرینی کی قوت رکھتی ہے اور اس میں فرسودگی کے آثار پیدا نہیں ہوتے...... مدینہ منورہ کا ذکر چغتائی صاحب کے کلام میں ایک زندگی ساز اور حیات آفریں قوت کے طور پر ہوا ہے۔ درِاقدس پر حاضری ہمارے وجود کو تمنائے محمد ﷺ بنادیتی ہے...... وہاں پہنچ کر ہمیں یہ خبر دی جاتی ہے کہ اب ہماری زندگی شروع ہورہی ہے...... مدینہ تو کون و مکاں کا خلاصہ اور انتخاب

ہے۔ مدینہ سے محبت مدینے والے سے محبت کا دیباچہ بھی ہے اور ثبوت بھی...... ذکر مدینہ میں امین راحت چغتائی کے ہاں نیا اور تازہ اسلوب ملتا ہے اور اس نوائے عاشقانہ میں جو تہذیب ہے وہ اپنی داد بھی ہے اور جزا بھی :

ذرا ٹھہرو، مدینہ آگیا ہے
ابھی ہونے کو ہے آغاز ہستی

وہ بھی دن آئے کہ پہنچوں جو درِ اقدس پر
دل مرا دل نہ رہے، اُن کی تمنا ہوجائے

تیری گلیوں میں پھروں، کون و مکاں کو دیکھوں
معجزے تیری عنایت کے دکھاؤں خود کو

اب اللہ کے فضل سے امین راحت چغتائی اس مقام پر ہیں جس کی خبر انہوں نے ہمیں یوں دی۔

وہ بھی مقام آئے محبت کی راہ میں
خود سے کروں کلام تو تیری خبر ملے

انہیں مژدہ ہو کہ سرکار ﷺ کی توجہ ان کے حال پر ہے اور ہمارے لئے یہ بات نوید ہے کہ ہم چغتائی صاحب سے رشتہ مودت وا خوت رکھتے ہیں۔

(نعت رنگ، شمارہ ۱۰، اپریل ۲۰۰۰ء)

غلامِ صاحبِ طیبہ

پاکستان بننے سے پہلے ہی جن شاعروں نے ادبی دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی حضرت شاعر لکھنوی ان میں شامل تھے۔ لکھنو شعر و سخن کا بڑا مرکز تھا۔ عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی، صفی لکھنوی اور جعفر علی خاں اثر کے بعد اس دیار شعراء نغمہ سے بلند ہوتی ہوئی آوازوں میں شاعر لکھنوی کی آواز بھی شامل تھی۔ اس آواز میں اردو کی تہذیب اور لکھنو کی رعنائی بولتی نظر آئی۔ یہ آواز تصویر کے رنگ اپنے دامن میں رکھتی تھی۔ یہ آواز سنائی بھی دیتی اور دکھائی بھی دیتی۔

حلیم مسلم کالج اور کرائس چرچ کے سالانہ مشاعرے یوپی کی ادبی فضا میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ ان مشاعروں کو سننے کے لئے قرب وجوار کے اضلاع کے صاحبان ذوق کانپور آتے۔ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور جگر مراد آبادی بھی ایک دو برس کے ناغہ کے بعد آجاتے۔ ان شاعروں کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے شاعر بھی ان مشاعروں میں شرکت کرتے۔ ان میں راز مراد آبادی، شاعر لکھنوی، اشعر ملیح آبادی کے نقش میرے ذہن میں تازہ اور گہرے ہیں۔

شاعر صاحب خوبصورت اور وجیہ نوجوان تھے۔ مشاعرے کے اسٹیج پر جو لوگ وقار اور تمکنت سے بیٹھتے وہ ان میں شامل تھے۔ عام شاعروں کی کوئی ''خفیف الحرکتی'' ان میں نہ دیکھی۔ شیروانی کے بٹن اوپر تک بند، کپڑے بہت با قاعدہ اور باضابطہ۔ ان میں شاعر صاحب سے دور کی ملاقات ہوتی۔ اس وقت کا تاثر یہ ہے کہ وہ مغرور تو نہ تھے مگر کم

آمیز ضرور تھے۔ رک رک کر بات کرتے جیسے اپنی گفتگو کو آپ سنسر کر رہے ہوں۔

یہ باتیں ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کی ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء میں، میں کراچی آ گیا۔ ۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں شاعر لکھنوی بھی کراچی آ گئے اور ہفتے میں دو ایک شامیں ساتھ گزارنے لگے۔

ہم کہ جو کبھی شاعر صاحب کے سامعین اور پسند کرنے والوں میں شامل تھے اب ان کے شناسائی بن گئے اور یہ شناسائی آہستہ آہستہ دوستی کے مرحلے میں شامل ہوگئی۔ تنقید میں ہم ادبی زبان اور پیرائے کو پیچھے چھوڑ جاتے لیکن شاعر صاحب سلیقہ گفتار کو فراموش نہ کرتے، تمکنت ان کے چہرے کی لکیروں میں سوتی رہتی مگر کبھی کبھی کسی کی غیر معقول بات کے جواب میں بیدار ہوجاتی۔ میرے مزاج میں بھی خاندانی روایات اور وضع بزرگان موجود تھی، اسی لئے ہر ایک سے بے تکلفی کا اظہار ممکن نہ تھا۔ اس وقت شاعر صاحب کی غزل گوئی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ لکھنو کی فنی تراش خراش کو موضوعات سے ہمکنار کرکے شاعر صاحب نے اپنی غزل کو عہد حاضر کے شعور اور مسائل کے ساتھ ساتھ آفاقی تفکر کا آئینہ بنایا تھا۔ ان کی غزل میں ایک شعری روحانیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ روحانیت جو ایک طرف نورازل کو بے نقاب دیکھنا چاہتی ہے اور دوسری طرف خیرالبشر ﷺ سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتی ہے۔

یہ سب باتیں ۱۹۶۹ء سے پہلے کی ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں، میں امریکہ چلا گیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں میرے پاکستان واپس آنے کے بعد ان سے بہت کم ملنا ہوا۔ وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئے اور ان کی یاد کبھی کبھی مہمان عزیز کی طرح ہمارے دلوں میں آجاتی۔

مئی ۲۰۰۰ء کی بات ہے کہ ایک شام حضرت شاعر لکھنوی کے صاحبزادے محمد ایاز پاشا کا فون آیا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ والد مرحوم کے نعتیہ مجموعے پر کچھ لکھانا مقصود ہے۔ یہ چند لفظ میرے لئے کیا معنی رکھتے تھے، فون کرنے والے کو بھی اس

کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ عزیزی ایاز پاشا آئے انہیں دیکھ کر میں خاصا جذباتی ہوگیا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال، حال بن گئے۔ اتنا طویل عرصہ ایک لمحہ بن گیا۔ ایسا لمحہ جس نے زمانے کو پاٹ دیا ہو۔ شاعر صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ اپنی کچھ نعتیہ رباعیاں تمہیں دوں گا ان پر کچھ لکھ دینا اور آج ان کا بیٹا ان کے نعتیہ مجموعے کے ساتھ آیا ہے۔ باپ کا وعدہ کس طرح وفا ہو رہا ہے۔ رباعیوں کی جگہ نعتیہ مجموعہ...... اور بیٹے کا چہرہ جیسے بدل گیا۔ اس کے خدخال شاعر لکھنوی کے نقوش میں بدل گئے یا یوں کہیے کہ ایک چہرے میں دو چہرے نظر آنے لگے۔ میرا رب اپنے وجود کا احساس کس کس طرح دلاتا ہے۔

یہ سب کچھ میں نے اس لئے لکھ دیا کہ آج شاعر صاحب کو جاننے والے بہت سے افراد الحمدللہ ہمارے درمیان موجود ہیں مگر نئے قارئین ان کی شخصیت اور احوال سے واقف نہیں۔ یہ تمہید ان کو اس مجموعے کے خالق کو سمجھنے میں مدد دے سکے۔

شاعر لکھنوی کا نعتیہ کلام سو وہ اپنا تعارف آپ ہے۔ ان شعروں میں گنبد خضریٰ پھول کی طرح مہکتا ہے اور پھر روضۂ اطہر کے افق سے ابھرتا ہوا کائنات پر چھاجاتا ہے۔ ان شعروں میں ملّت بیضا کی ستارہ منصبی کے مناظر ہیں۔ یہ ملّت جو روشنی کے منبع سے اپنے آپ منور کرتی ہوئی انسان سازی اور تاریخی سازی کے عمل کو اپناتی ہے۔ شاعر صاحب کی نعتوں میں خوشبوئے محمدؐ ایک معطر اور زندہ تجربے کی طرح ہمارے وجود کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے۔ ان شعروں کو پڑھتے ہوئے قاری کے دیدہ تر میں ایک چراغاں سا ہوجاتا ہے اور پھر کون ومکاں کا ہر منظر، ہر حسن اور ہر امکان اس کے دامانِ نظر میں گم ہوجاتا ہے۔

نعت کا موضوع وہ ذاتِ اقدس ہے جو ایک طرف خدا سے واصل ہے اور دوسری طرف خلق میں شامل ہے۔ یہی وہ ذات ہے جس نے انسان پر اس کی عظمت واہمیت

کے درواکئے اور انسان کو مقام آدمیت سے آگاہ کیا۔شاعؔر لکھنوی نے اس صنفِ سخن (نعت) کے بارے میں اپنی نعتوں میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

اپنا ایماں ہے کہ شاعؔر، نعت سے بڑھ کر
کوئی سرمایہ ہماری شاعری کے واسطے

شاعؔر لکھنوی نے نعت کو شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ اس عہد میں قرار دیا جب سنجیدگی کے ساتھ نعت کو ادب اور شاعری کا حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا حالانکہ حالؔی سے جگر مراد آبادی تک ہمارے بڑے شاعروں نے نعت کے ذریعے انسانوں کے سامنے ایک آئیڈیل پیش کردیا تھا لیکن ہمارے نقادوں نے نعت کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ دوسری طرف یہی نقاد مرثیہ اور دوسری مذہبی شاعری کو ادب میں جگہ دیتے تھے۔یہ تو نوائے ظفر علی خان اور نغمہ اقبال کی تاثیر اور کرشمہ ہے کہ نعت کی طرف توجہ دی گئی۔ شاعؔر لکھنوی کے فنی شعور اور نعتیہ شاعری کا بھی فضا کی اس تبدیلی میں دخل ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن کی وجہ سے ہماری محفلِ شعر میں ثنائے خواجہ دوجہاںﷺ کے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ نعت کہنا اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے۔حقیقی زندگی وہی ہے جو انؐ کی یاد میں گزرے اور زندہ لمحے وہی ہیں جو انؐ کی محفل میں بسر ہوں۔چودہ صدیوں سے کوئی بھی تخیل اور فکر رکھنے والے کو انؐ کی سرکار میں پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔ انؐ کے ذکر سے ہم حقیقی زندگی کے تجربے سے گزرتے ہیں۔

نئی حیات ملی جب بھی کوئی نعت کہی
میں زندگی میں کئی بار زندگی سے ملا

محمدﷺ، شاعؔر لکھنوی کے لئے ایسی تمنا ہیں جو زندگی کو بامعنی بنا دیتی ہیں۔ انؐ سے ہمارے تعلق کو کوئی نام دینا ممکن ہی نہیں، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہؐ ہمارا نام ونسب ہیں۔شناخت اور پہچان کو شجرہ نسب بھی کہا جاسکتا ہے۔ شاعؔر لکھنوی اس منزل پر پہنچ گئے

تھے کہ ہر دوسری شناخت کی طرف سے انہوں نے منہ موڑ لیا تھا۔لکھنو کو چھوڑ کر وہ اس مملکت کے باسی بن گئے تھے جو مدینہ کی اسلامی ریاست کے بعد انسانی تاریخ میں اسلام کی حیات بخشی کا ثبوت بنی۔ وہ ریاست اور دیار جس کا ایک نام طیبہ بھی ہے۔ طیبہ کی پاکیزگی، اس کی حلاوت، ہمارے لہو کا حصہ بن کر ہمیں اسلام کی قدروں کا نمائندہ بنادیتی ہے۔ ہماری شناخت مدینہ کی زمین کے ذرے اور اُحد کے وہ پہاڑ ہیں جو آج بھی بازوئے نگراں معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری ثقافت کی تلاش ہڑپہ اور موہن جوداڑو کے آثار اور کھنڈروں میں کرنے والے ترکیب قوم رسول ہاشمیؐ سے بے خبر ہیں۔شاعؔر لکھنوی کی نعتیہ شاعری ہم سب کو اپنا نسب یاد دلاتی ہے۔

غلامِ صاحبِ طیبہ ہوں شاعؔر
مرا تو بس یہی نام ونسب ہے

جس کا نام ونسب محمدﷺ کی غلامی ہوا سے شریعت کی زبان میں مسلم کہتے ہیں۔مسلم وہ ہے جو اپنے نفس کو اس پیغام کو رضا و رغبت کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کرلے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

ان دینی حقائق کو شاعؔر لکھنوی نے شعر بنادیا۔شعروادب کی دنیا میں یہ معجزہ اس وقت رونما ہوتا ہے جب شاعر کی فکر، اس کے جذبات، اس کا عمومی رویہ اور پوری قوت۔ اپنے الفاظ اور اظہار کے ساتھ کسی عقیدے یا بڑی فکر سے اس طرح وابستہ ہو کہ یہ وابستگی اس کا ایمان بن جائے۔

ایسا آدمی اپنے دل اور نگاہ کو اپنی دنیا بنالیتا ہے اور اس دنیا سے باہر کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جس کی کوئی قیمت ہو۔حضورﷺ جب دل میں جذب ہوجائیں اور نگاہوں میں حل ہوجائیں تو سارا جہاں ایسے آدمی کے لئے سوادِحرم بن جاتا ہے۔

دل ونگاہ سے باہر نہ ڈھونڈیے انؐ کو
دلوں میں جذب نگاہوں میں حل محمدؐ ہیں

یہی وہ نگاہ کی مسلمانی ہے' یہی وہ منزل ہے جب مسلمان کائنات کی ہر شے کو اللہ تعالیٰ کے راستے پر گامزن دیکھتا ہے۔ سورج اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے' چاند اسی کی طرف سفر کررہا ہے' ہواؤں کی رخ اس کی رضا کی طرف ہے اور گردش شام وسحر اس کا اور اس کے رسولؐ کا کلمہ پڑھتی سنائی دیتی ہے۔

مدینہ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر ہے۔ اس شہر کی ہر نشانی ایک ہی ذات کی عکس نما ہے۔ ایک ہی ذات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہاں ایک ہی چہرہ ابھرتا ہے۔ وہ چہرہ جو انسان کی تمثال ہے۔ انسان کامل کا چہرہ کہ ہر خیر اس کے خدوخال کا درجہ رکھتا ہے اور یہاں تک پہنچنے کے لئے شاعر کسی اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے دل کی دھڑکن پہ سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

ان کی معراج تو عرش عظیم تک پہنچنا تھا اور ہماری معراج مدینہ کی سرزمین تک پہنچنا ہے۔ ان اشاروں کی روشنی میں یہ تین اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئے طیبہ میں رہا اپنا قیام
کیا مکاں تھا جس کو گھر ہم نے کیا
سامنے ایک ہی چہرہ آیا
جب بھی ادراک بشر ہم نے کیا
شاعرؔ اس در پہ پہنچنے کے لئے
دل کی دھڑکن پہ سفر ہم نے کیا

شاعرؔ لکھنوی کے اس نعتیہ مجموعے میں معراج سے متعلق جتنے شعر ہیں شاید ہی کسی دوسرے مجموعے میں ملیں۔ معراج کے حوالے سے شاعرؔ صاحب نے زمان ومکاں کے

مسائل کو شعری حسن اور لطافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زمیں سے آسماں تک کا سفر' انبیائے کرام سے ملاقات' جنت ودوزخ اور آنے والے زمانوں کے چہرے سے نقاب کا اٹھنا۔ میں نے ان اشعار کو دانستہ اس تحریر میں شامل نہیں کیا ہے' ہاں آپ کی توجہ اس طرف مبذول کروائی ہے' صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

آیا ہے سر عرش اعظم اک نور مجسم کیا کہیئے
اڑتے ہوئے لمحے کیا کہیئے ٹھہرا ہوا عالم کیا کہیئے

اس شعر پر آپ کی فکر کئی عقدے سے آپ پر کھول دے گی اڑتے ہوئے لمحوں اور ٹھہرے ہوئے عالم کے تضاد اور ان سے وجود میں آتی ہوئی وحدت سے معراج کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اور پھر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اسمائے صفاتوں میں نئے نور کا انتخاب۔ روشنی کی رفتار سفر تو ہمیں معلوم ہے اور اسی میں نور مجسم کی رفتار سفر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اقبال نے کسی جگہ لکھا ہے۔

All Prophets were Muhammad in Making

اس خیال کی گہرائی نے ہمیشہ مجھے عالم تحیر میں پہنچادیا ہے۔ اس بڑی سچائی اور نہایت گہرے خیال اور تجربے کو شاعرؔ لکھنوی نے نعت کا شعر بنا دیا ہے۔

شامل رہا نبوت آقاؐ میں ہر نبیؐ
دریا بقدر ظرف سمندر میں رہ گیا

یہ نعتیہ مجموعہ ان کی ستارہ منصبی کی سند ہے۔

روشنی کی اک کرن ہم کو بھی اے ماہ مبیںؐ
ہم بھی حاضر ہیں ستارہ منصبی کے واسطے

(نکہت ونور/ شاعرلکھنوی، ۲۰۰۰ء، جہاں حمد پبلی کیشنز، کراچی)

اساس

ساری دنیا میں انسان اپنی جڑوں کی تلاش کررہا ہے۔ اپنی اساس کو دریافت کرنے کی سعی وکوشش کی جارہی ہے۔ اس تلاش کی ایک شکل تو Roots ہیں اور دوسری صورت ''اساس''۔ پہلی شکل تو محض ایک ماضی اور اپنے اجداد سے اپنے کو وابستہ کرنے کی تحریک ہے اور دوسری صورت اپنی روایات' اپنی ذات' اپنے حقیقی وجود' اپنے ''اسم'' کے تلازموں' اپنے حال' اس کائنات' اپنی آنے والی منزل اور اپنے دارالقرار کے تعین اور دید کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے منکشف کرنے کی کوشش ہے۔ یہ وہ کوشش ہے جو مرشدِ رومؒ کے استعارے کے مطابق ''گریۂ نے'' ہے روح انسانی نے بن کر اپنے نیستاں اور نے نواز کی تلاش میں گریہ کناں ہے۔

سرشآر کی روح عالم ارواح سے عالم اجسام میں آئی اور ہنگامہ گوش ونظر میں گم ہوگئی۔ اپنی ان سعادتوں سے دور ہوگئی جو نیستاں میں اس کا حصہ تھیں اور عالم اجسام کی لذتوں میں گم ہوگئی مگر ایک خلش تھی جو ہنگامہ نشاط میں بھی اسے پریشان رکھتی پھر یوں ہوا ایک سعادت آثار سعادت میں اس روح نے دنیا کی سب سے سادہ عمارت کے سامنے اس عمارت کے آئینے میں اپنے آپ کو پالیااور پھراس کے ہونٹوں پر یہ نغمہ ابھرا:

جو میری روح نے پیماں کیا تھا روزِ ازل
میں اپنے آخری لمحوں میں اس کا ایفا ہوں
اوراس گھڑی سے اب تک

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وزجدائی ہا شکایت می کند

اوراب ہرلمحہ ذہنی اور جذباتی طور پرعربی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ غلام اور امتی اپنے رفیقِ اعلیٰ سے ملاقات کے لئے آمادہ ہے اور حافظ شیراز کی طرح وہ بھی اس منزلِ ویراں کاباسی نہیں بلکہ شہرابد کی طرف سفرکرنے والا ایک راہی ہے اوراس کا یہی قول ہے :

خرم آں روز گزیں منزل ویراں بردم
راحت جاں طلبم و پئے جاناں بردم

شعوری طور پر''اسلام'' قبول کرنے سے پہلے بھی سرشآر صدیقی کی رگوں میں اپنے جدِمکرم کا خون لہریں مار رہاتھا' اس نے سرشآر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات سے کبھی باغی نہیں ہونے دیا۔ یہ اسکی نہیں بلکہ اس کے لہو کی تصدیق تھی۔''ابجد'' اور'' بے نام''میں بھی اس نام کے نغمے ہیں جو غار میں ''ثانی اثنین'' تھا۔ جس کا سر اس کے دوست کے زانو پر تھا اور جو اپنے صاحبؐ کے روئے انور کی تلاوت کررہاتھا۔ اس لمحے کی روشنی ظلمتوں کے دور میں بھی سرشآر کی زندگی کو منور کررہی تھی اور اس کا سبب سرکار ختمی مرتبتؐ کا قول یہ تھا کہ:

''اول ماخلق اللہ نوری'' اور روحِ محمدیؐ سے تمام دوسری روحیں
پھوٹیں اور اس طرح پھوٹیں کہ جس طرح درخت سے شاخیں پھوٹتی ہیں۔''

(مولانا آزادسبحانی)

سرشآر اپنے علم اور اختیار کے بغیر شجرِ محمدیؐ کا ایک پتہ تھا اوراس بات کا شعوری ادراک سرشآرکو۱۳ مارچ ۱۹۸۴ءکو روضہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوا۔

مدینے والے سے سب کچھ بتادیا میں نے
بہت سکوں ہے گناہوں کے اعتراف کے بعد

اور اس اعتراف کے بعد ہی سرشار نے اپنے آپ کو ''نومسلم'' کہا۔ اسلام نام ہے اپنے نفس کو اس کے تابع بنانے کا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ یہ بات سرشار صدیقی کی زندگی کی حقیقت اس جگہ بنی جو زمین کا مقدس ترین ٹکڑا تھا۔حرم کعبہ سے بھی زیادہ محترم:

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہ مصطفیٰ
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

سرشار نے یہ نکتہ روضہ رسولؐ سے حاصل کیا۔'' لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیؐ'' اپنی آواز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو۔'' یہی اسلام ہے' یہی اطاعت ہے اور اس حقیقت تک جب سرشار کی رسائی ہوئی تو عملی زندگی میں نگاہیں جھکی جھکی رہنے لگیں۔ زیست کے قرینے بدل گئے۔ دوستی کی شرائط اور معیار کا ازسرنو تعین ہوا اور فکری وجذباتی وجود بھی نئے سانچے میں ڈھل گئے۔ سرشار نے اپنے لہجے کو نئے آداب میں ڈھالا۔ اسے ایک ایسا لہجہ صحن حرم میں عطا ہوا جس میں اب انا کے تماشائے یک رنگ کی جگہ عجز کا جلوۂ صد رنگ ہے۔اس لہجہ میں اس سجدے کی عظمت اور سربلندی ہے جو صدیوں کی امانت تھا اور یہ امانت اب ادا کی گئی ہے۔یہ وہ عجز ہے جو سربلندی آدم کی علامت ہے۔

نئے لہجے میں بصد عجز وندامت لکھوں
صرف اشکوں کی زباں میں تری مدحت لکھوں

حمد کے وسیلے سے شاعر کو نیا لہجہ ملا اور اس لہجے کو عبادت کا نم نعتوں نے عطا کیا۔

نعتوں میں برتتے ہیں آداب عبادت کے
ہر چند غزل میں ہم شوریدہ بیاں ٹھہرے

سرشار کے ہاں محض نعت نہیں ہے بلکہ نعت کا ایک دائرہ ہے۔ کئی تخلیقات حمد و نعت

کا سنگم ہیں اور پھر ''اساس'' میں ان شخصیتوں پر نظمیں ہیں جو حیاتِ نبویؐ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ ام النبی حضرت آمنہؓ سے لے کر خلفائے راشدینؓ صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ تک ۔ ام النبی حضرت آمنہؓ وہ صدف ہیں جس سے کائنات کو اپنا دریتیم حاصل ہوا اور رفیقانِ محمدؐ ان کی صداقت کی سب سے معتبر گواہی اور سب سے بڑے معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نعت وعقیدت کے اس دائرے میں کتاب عظیم اور حرمین کی خاک پاک کے ذرے اور مناظر بھی شامل ہیں۔''اساس'' نعتوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ شعر عقیدت ہے اور عقیدت کا ہر موضوع اور کردار مرکز احدیت اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم رشتہ ہے۔

سرشار نے عقیدت وایمان کا ایک شعری منظر نامہ مرتب کیا ہے اور اس انداز سے کہ یہ مجموعہ تمام ایسے مجموعوں سے الگ ہوگیا ہے جنہیں ہم نعتیہ مجموعے کہتے ہیں۔ یہ ایک روح کا سفر ہے اور شاعر کی سوانح ہے' محض شعر یا عقیدت کی وادی میں گزارے ہوئے چند لمحات نہیں۔ سرشار نے ۱۹۸۴ء تک ایسی زندگی گزاری جس پر شرمندگی کا کوئی سبب نہیں۔ رزق حلال' حلقہ احباب' ایک پیار کرنے والا گھرانہ' ذہن رسا' شہرت' خاصی خوشحالی۔ یہ سب اسے حاصل تھا لیکن لحہ وصال میں بھی کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی۔ ویسے بھی حساس روحوں کا یہ مقدر ہے کہ نغمہ وصل اور گریہ فراق کے درمیان کچھ ایسا فصل نہیں ہوتا۔ آخر مارچ ۱۹۸۴ء میں اس کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جسے نیا جنم کہنا درست ہوگا۔ آواگون تو ایک سلسلہ فریب ہے مگر آدمی کا نیا اسلوب حیات اس کی نئی زندگی ہی ہوتا ہے۔ سرشار کی نئی زندگی میں اس کا کچھ ایسا عمل دخل نہیں ہے بلکہ یہ زندگی توفیق الٰہی ہے۔

سرشار مرا مصرع' میری ہی سوانح ہے
تدبیر یہاں روکے' تقدیر وہاں ٹھہرے

اور اب اس کی سعادت یہ ہے کہ روکنا اور ٹھہرنا دونوں ہی میں برکتیں ہیں۔ تقدیر وتدبیر یوں بیک وقت کسی کے حق میں مہربان کم ہی ہوتی ہے۔

سرشارؔ کے شعرِ عقیدت میں عقیدتوں کا ایک ایسا تسلسل نظر آتا ہے جو انسانی زندگی کے تسلسل کا اشاریہ ہے حمد کی موج نعت کی موج سے ہم آغوش' نعت کی موجوں کو صحابہ اور ذریت رسولؐ کی منقبت کی موجیں اپنے حصار اور دائرے میں لئے ہوئے۔ یہ بات شعری اور فکری طور پر بڑی اہم ہے اور اس پر مختصر گفتگو ضروری ہے۔

ہمارے عہد میں رسمی نعتوں کے علاوہ سیکولر نعتوں کا بھی فیشن ہے۔ اللہ سے منہ موڑ کر رسول کریم کی عظمتوں کی ''دریافت'' اور تذکرہ۔ یہ ویسی ہی شاعری ہے جیسے مصوتہ (Vowel) کے بغیر گفتگو کرنے کی کوشش ایسے نعت گو رسولؐ کا ذکر بھی اسی طرح کرتے ہیں جیسے دوسرے رہنماؤں اور مصلحوں کا ذکر۔ یہ اس پیمانے اور اسکیل سے بے خبر ہیں جس سے ہم رسول کی عظمت کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی رسول بالعموم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص ربِ کائنات کا سب سے بڑا شاہکار ہیں۔ یہ نظامِ شمسی' یہ کائنات کی پہنائیاں' یہ فضاؤں کی بے کرانیاں' یہ سب ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ذات کے ایک گوشے میں سمٹ کر گم ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ ذات ہے جو ہمارے لئے خالق نما بن جاتی ہے اور حمد میں نعت بھی سمٹ آتی ہے۔ سلسلہ تخلیق کو تو دوربینوں اور سائنسی تجربوں سے سمجھا جا سکتا ہے مگر خالق تک رسول کے بغیر رسائی ممکن نہیں۔ حالانکہ یہ خالق اپنی ہر تخلیق کے آئینے میں موجود ہے۔ سرشارؔ نے اس نکتے کو سمجھ لیا ہے۔ اس کے ہاں حمد و نعت یکجا ہو گئی ہیں:

طواف کعبہ میں تھی کس کے نقشِ پا کی تلاش
خدا کا نام لیا' اور اسے پکار آیا

حمد ان جذبات ستائش کا نام ہے جو کسی ایسے حسن اور تناسب کو دیکھ کر دل میں

موجزن ہوں جو تمام حسین اور متناسب اشیاء کے حسن اور تناسب کے ناپنے کا حوالہ بن سکے۔ ہم خدا کی ذات کا نظارہ تو نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی آنکھ اس حسن کو نہیں دیکھ سکتی مگر یہ ذات ہر حسن کا حوالہ بن جاتی ہے اور ایسا سب سے بڑا حوالہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہی وہ تصویر ہے جو ہمیں اس کے مصور کے بارے میں سب سے زیادہ علم عطا کرتی ہے' حالانکہ وہی مصور کائنات کے کینوس پر بے شمار رنگوں کی صورت موجود ہے مگر اس کی صفات کے رنگ جتنے اور جس حد تک سرکار ختمی مرتبتؐ میں موجود ہیں کہیں اور نہیں نظر آئیں گے۔ پھر حمد کے لئے یہ شرط بھی ہے کہ ''حسن'' کی جو تعریف بیان کی جائے وہ تخمینی اور ظنی نہ ہو بلکہ ہمیں اس کی صحت پر اعتماد اور یقین ہو۔ اللہ اور اس کے رسول کی تعریف ہم ایمان' یقین' اپنے وجدان اور بصیرت کی استوار بنیادوں پر کرتے ہیں۔ ہمیں جس طرح اللہ کے خالق کائنات ہونے پر یقین ہے اسی طرح اس بات پر بھی ہے کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان سب سے مضبوط وسیلہ اور رشتہ ذات محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ان کی صفات میں کمال بھی ہے اور جامعیت بھی۔ وہ ذات' حمد کے دائرے کے اندر آ جاتی ہے جو حامد بھی ہے' احمد بھی اور مقام محمود پر فائز بھی' جو خوف وحزن سے بالاتر ہے' جب علمائے شعر و بلاغت نے حمد کو ایسی صنف قرار دیا ہے جو صرف اللہ سے مختص ہو تو شاید یہ نکات جن کا تعلق نبوت سے ہے ان کے ذہن میں نہ تھے۔ اللہ اپنی ذات اور صفات میں کسی کی شرکت سے بالاتر ہے اور شرک ظلم عظیم ہے مگر اللہ نے اپنے نبی کو جس مقام پر سرفراز فرمایا ہے اس کو بھی ذہن میں رکھنا لازم ہے۔

رسول ایک طرف اپنے رب سے متصل ہوتا ہے اور دوسری طرف انسانوں سے پیوستہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو انسانی حقوق' اخلاق حسنہ کا نقطہ عروج بنا دیا جو شقاوت میں پتھروں کی طرح بلکہ ان سے بھی سخت تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے تین معجزات ہیں۔ آپ کی حیاتِ طیبہ'

قرآن حکیم اور صحابہ کرامؓ۔ کوئی اچھا نعت گو ان معجزات سے صرف نظر کر کے نعت نہیں کہہ سکتا۔ سرشارؔ کے شعرِ عقیدت میں ان تینوں معجزوں کا ذکر مسلسل ملتا ہے۔ سرشارؔ نے ام النبیؑ ازواج مطہراتؓ ذریت محمدؐ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حضور اپنے جذبات عقیدت پیش کئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی، فوز کبیر اور کامگاری کی سب سے بڑی شہادت صحابہ کرامؓ ہیں۔ امت محمد یہ کا ایک بڑا حصہ صحابہ کرامؓ کو انبیائے عظام کے بعد انسانوں میں سب سے بلند، سب سے برگزیدہ قرار دیتا ہے اور انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی بنا پر ہدایت کے ستارے سمجھتا ہے۔ جبکہ ایک دوسرا گروہ معاذ اللہ صحابہ کرامؓ کو منافق ٹھہراتا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو صحابہ میں سے صرف پانچ افراد مسلمان تھے اور باقی ...... یہ گروہ کس قدر شقی القلب اور مرتبہ نبوت سے بے خبر ہے۔ معاذ اللہ اس سے زیادہ کسی رسول کی ناکامی اور کیا ہوگی؟ صحابہ کرامؓ کا درجہ تو یہ ہے کہ قرآن عظیم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ''والذین معہ'' کو شامل کر کے کہا کہ یہ کافروں پر شدید ہیں، آپس میں رحیم ہیں اور اللہ کے فضل سے سرفراز۔ یہ وہ ہیں کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔

''والذین معہ'' کا ٹکڑا تمام صحابہ کے لئے ہے لیکن اس کا اولین مصداق وہ صاحب فضل ہے جو سرشارؔ کا جدامجد ہے۔

> '' پیغمبروں کے بعد دنیا کی تاریخ میں یقین کی جو سب سے بڑی مثال ملتی ہے وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہے اور اس یقین واستقامت میں ان کی صدیقیت کا راز پنہاں ہے۔ اہل بصیرت کا یہ کہنا بالکل حق ہے کہ ابوبکرؓ پیغمبر نہیں تھے مگر کام انہوں نے پیغمبروں کا سا کیا۔

> آج روئے زمین پر جہاں کہیں اسلام کا کوئی رکن ادا ہو رہا ہے، کوئی اسلامی شعار بلند ہے اور کہیں دین پر عمل ہو رہا ہے اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا حصہ ہے۔ آج نماز کی ہر رکعت، زکوٰۃ کے ہر پیسے، روزے کی ہر گھڑی، حج کے ہر رکن کے ثواب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا حصہ ہے۔ اس لئے گویا اگر زکوٰۃ کے بارے میں ڈھیل دی جاتی اور فتنہ ارتداد کے ساتھ رواداری برتی جاتی تو نہ نماز رہتی، نہ روزہ، نہ حج۔'' (مولانا سید ابوالحسن ندوی)

یہ سب کچھ یوں عرض کیا گیا کہ اس پس منظر کو سامنے رکھے بغیر سرشارؔ کے شعر عقیدت کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ اللہ کی مشیت کا کیسا کیسا اظہار اس ذات گرامی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ذریعے ہوا جس کا ایک صفاتی نام اس کتاب کا نام ٹھہرا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے ایمان کی اساس ہیں اور یہ سطور ۲۷ رجب المرجب کو لکھی گئی ہیں اور میرا قلم مجھے یاد دلا رہا ہے کہ رب محمد نے ''قانونِ ظاہری میں رعایتوں'' کو روحِ محمدیؐ کے تصرف میں دے دیا تھا۔

جب روحِ محمدیؐ تمام ارواح، تمام اجسام، تمام حیات کا سرچشمہ ٹھہری تو اس ذات کے حوالے کے بغیر حضور کی نعت کیسے کہی جاسکتی ہے جس کے وسیلے سے اس زمین پر حضور کا ظہور ہوا اور!

''آخری پھول کھلا باغِ نبوت مہکا''

(سرشار)

ذات ام النبی صلوٰۃ اللہ علیہا کی ذات تھی۔ جب وہ لمحہ آیا کہ تخلیق کائنات کا راز۔

صورت انکشاف چاہتا تھا
قبلہ عرش و فرش کے اطراف

کعبہ اذنِ طواف چاہتا تھا

نگاہ ارض وسما حضرت آمنہؓ کی طرف مرکوز ہوگئی کیونکہ یہی وہ ذات تھی جسے گلِ آفرینش کی شاخ کے طور پر چنا گیا تھا۔

فیصلہ ہے نظام قدرت کا
شاخ لازم ہے پھول سے پہلے
تیری تخلیق ناگزیر ہوئی
دو جہاں کے رسول سے پہلے
تیری عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے
تجھ سے جبریل ہم کلام ہوئے
آیتوں کے نزول سے پہلے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر زبان واسلوب کے ان سارے قرینوں اور سلیقوں کا تقاضہ کرتا ہے جو ذہن، فن اور زبان پر انسانی دسترس کی آخری حدوں پر نظر آتے ہیں۔ سرشاؔر کی نظم ام النبی' سرشاؔر کی شعر گوئی اس کے مومن قلب اور اردو زبان کے امکانات کی بیک وقت شہادت ہے۔ اس کی ایک ہی نظیر اس سے پہلے مجھے نظر آئی ہے۔

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر سلیقے اور ڈھنگ سے بعض میلاد ناموں اور شاہنامہ اسلام میں بھی ملتا ہے مگر حضرت آمنہؓ کی عظمت کا یہ انداز اور یہ ادراک مختلف چیز ہے۔

تاریخی شخصیتوں کی زندگی اور کردار کو تفصیل کے ساتھ ناول میں بھی پیش کیا جاسکتا

ہے اور نظم میں بھی ۔ غزل کے شعروں میں بھی ان کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں فنکار میں تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ تخیل کی متناسب فراوانی ضروری ہے۔ ایسا تخیل جو زمان ومکان کے تناظر میں ان کرداروں کو متحرک، جیتا جاگتا اور اپنے تاریخی فریضے کو ادا کرتا ہوا دیکھ سکے۔ دینی شخصیتوں کے سلسلے میں ایک اور عنصر بھی شامل ہوجاتا ہے اور وہ ہے اپنے کرداروں کے اقدار حیات اور معتقدات پر شاعر کا عملی یقین۔ یہی وہ بات ہے جسے اقبال نے ''دل و نگاہ کا مسلمان ہونا'' قرار دیا تھا۔ سرشاؔر نے امہات المومنینؓ، اپنے جد امجد سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں لفظ کہیں پھول ہیں اور کہیں نظر۔ سرشاؔر نے اپنے تخیل کی مدد سے ان کرداروں کو شہر رسول میں محفل رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جیسے دیکھا ہے اور سنا ہے۔ حضرت بلال حبشیؓ ہم کو اذان بن کر سنائی دیتے ہیں۔ مؤذن کا اذان اور اذان کی علامت بن جانا بھی سرکار کا ایک معجزہ ہے۔ کہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے کردار کی تصویر ان کے کمال بصیرت اور جمال رفاقت کے رنگوں سے بنائی گئی ہے اور بی بی حلیمہ سعدیہ کی خوش بختی کو ان کے دودھ کے فیضانِ اثر میں تلاش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کا ایک حصہ'' جد اعلیٰ'' ہے ۔ وہ جد اعلیٰ عشق وعمل، ایثار وقناعت کا پیکر ہے جس کے خون نے سرشاؔر کے وجود کو اعتبار بخشا اور اسی خون کے واسطے سے اس نے حق گوئی کی امانت اپنے بچوں تک پہنچائی۔ حضرت صدیقؓ کی عکس کشی کا ایک استعارہ ''سفر'' بھی ہے۔ سفر بلد امین سے مدینہ رسول تک، سفر بدر کے معرکہ سے حج الوداع تک، سفر غار سے قبر تک، حضرت ابوبکر صدیقؓ ہر جگہ اپنے صاحبؐ کے ساتھ ہیں۔ یہ چند مثالیں ہیں۔

اس مرقع عقیدت میں حضرت حمزہؓ حضرت عائشہؓ حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ اور ان کے شہید بیٹے حضرت حسینؓ اپنی صفات کے رنگوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان تصویروں میں کم سے کم لفظوں کا صرف کیا گیا ہے۔ یہ وہ خاکے ہیں جن میں

مصور کم سے کم خطوط سے اپنی مراد پالیتا ہے بلکہ ایک ہی جنبش سے خطوط یا خط کا دائرہ مکمل ہوجاتا ہے۔ یہ مجموعہ تو آپ کے ہاتھوں میں ہے' سو میں مثالوں سے گریز کرتا ہوں مگر چند مصرعے جو میرے ذہن میں مقیم ہیں' آپ سن لیجئے۔ میں نشاندہی نہیں کروں گا۔ یہ مصرعے کن ہستیوں سے متعلق ہیں؟ یہ بات تو آپ سے یہ مصرعے ہی کہیں گے :

صرف ان کا اور ان کے نبی کا ذکر کروں
جو اپنے کردار کے حوالے سے
خود ہی شمشیر بے اماں ہے
خون کے چھینٹوں کی صورت میں

قرآں کے صفحات پہ آج بھی زندہ ہے
جو اپنے پیش رووں کا حلیف تھا

مجھے یقین ہے کہ یہ مصرعے متعلقہ شخصیتوں تک آپ کو پہنچادیں گے' لیکن اگر کوئی دوسری شخصیت آپ کے ذہن میں آئی تو اس میں بھی آپ کے لئے ایک پیغام اور نکتہ مضمر ہے اور وہ ہے اصحاب محمدؐ رضی اللہ عنہم اجمعین کی زندگی' کردار اور صفات کا اشتراک یہی اصحاب کبار اقبال کے اس مصرع کا مصداق ہیں۔

آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمٰن

اس مجموعے کی بیشتر نعتیں غزل کی فارم میں لکھی گئی ہیں۔ ''اگرچہ ہمارے شعراء نے مسدس اور مخمس سے لے کر معریٰ اور آزاد نظم تک تمام اصنافِ سخن کو ثنائے خواجہ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استعمال کیا ہے مگر غزل کو اس مقصد کے لئے آج بھی سب سے زیادہ استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں' ایک تو دو مصرعوں میں بات کا مکمل ہوجانا۔ یوں غزلیہ نعت کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل نعت ہوتا ہے کیونکہ شعر غزل کی

قائم بالذات اکائی ہے۔ دوسرے غزل کے نظام علائم ورموز پر تصوف کا سایہ ہے اور یوں محدود سے لامحدود کی طرف سفر ان علامتوں کے ذریعے سہل ہوجاتا ہے۔ لامحدود کی طرف شاعر کا سفر اس کی تقدیر بھی ہے اور شعر کا مقدر بھی۔

سرشارؔ نے غزل کے پیکر کو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثنا سے ایسا اور اس طرح روشن کیا ہے کہ نعت ایک سیارۂ نور اور ''شرار معنوی'' بن گئی ہے۔ میرے ذہن نے نعت کا ایک معیار قائم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا کوئی شعر' کوئی جزو ایسا نہ ہو جو غیر نبی کی تعریف وتوصیف کے دائرے میں داخل ہوسکے یا جو شرک فی النبوت کی مثال بن سکے۔ شرک اللہ کے باب میں بھی ہوتا ہے اور رسولؐ کے سلسلے میں بھی۔ مثلاً

گہ سوئے علیؓ گاہ نظر سوئے محمدؐ

رجعت خورشید اور شق قمر سے ہے عیاں
ہے نبی مالک لیالی کا 'علیؓ ایام کا

اور اب ایسی مثالیں ملاحظہ ہوں جن کے لہجہ اور مضامین کو نعت سے کوئی علاقہ نہیں۔ شاعروں کا نام دانستہ نہیں لکھا جارہا ہے۔

تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
مرے چمن کی فضائیں سلام کہتی ہیں
وہ عہد گل' وہ لب جو' وہ بزم سرووچمن
وہ قمریوں کی صدائیں سلام کہتی ہیں

یہ میرا اضطراب شوق' رشک جنونِ قیس ہے
جذبہ بہ جذبہ' دل بہ دل' شیوہ بہ شیوہ' خو بہ خو

جس میں ہو ترا ذکر، وہی بزم ہے رنگیں
جس میں ہو ترا نام، وہی بات حسیں ہے

سرشآر صدیقی نے بنیادی طور پر نعت کے لئے غزل کے پیکر کو چنا ہے، لیکن کوئی شعر ایسا نہیں ہے جو سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی محبت اور مرتبے کی طرف اشارہ نما نہ ہو۔ غزل کی شوریدہ بیانی، نعت میں آداب عبادت کے قالب میں ڈھل جاتی ہے:

نعتوں میں برتتے ہیں آداب عبادت کے
ہر چند غزل میں ہم شوریدہ بیاں ٹھہرے

شاعر نے عبادت کے آداب برتنے کا دعویٰ تو کیا ہے لیکن میرا قیاس یہی ہے کہ لہجہ خود عبادت کے آداب میں ڈھل جاتا ہے۔ سرشآر کے عشق رسالتِ مآب میں گم گشتگی بھی ہے، توفیقِ الٰہی کا شکر بھی ہے، بچوں کا سا تحیر بھی ہے اور قلب مومن کی وسعت بھی ہے مگر ابھی ''انائے شاعر'' نے اس کا تعاقب نہیں چھوڑا ہے۔ ابھی آگ کو خاکستر بننا ہے اور اپنی نفی کرنی ہے۔

اس طویل جملہ معترضہ کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ عرض یہ کررہا تھا کہ عشق محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظوں میں ایک کیمیاوی تغیر برپا کردیا ہے۔ عشق اپنی کیمیا آپ ہے:

سرکارؐ کے قدموں سے اٹھ کر دل دیوانہ
جائے تو کہاں جائے ٹھہرے تو کہاں ٹھہرے

ہر لفظ تغزل کا پیمانہ ہے، لہجے میں عشق کی سرمستی ہے۔ مگر ''سرکار'' کا لفظ یوں صرف ہوا ہے کہ دل کی بے قراری کو قرار بلکہ ثبات مل گیا ہے۔ اسی نعت میں سرشآر نے ایک نئے استعارے بلکہ ایک مکمل تلازمۂ خیال وتاریخ کو جنم دیا ہے۔ حضرت ابوایوب

انصاریؓ کے دروازے پر ناقہ رسالتؐ آ کر رک گئی تھی اور سرشآر نے اپنی زندگی کو اسی ناقہ کے روپ میں دیکھا ہے۔ یہ ناقہ ہستی بھی اپنے راستوں کا تعین نہیں کرسکتی، اس کے لئے تقدیر، تدبیر ہے اور تدبیر تقدیر۔ اور یہ دونوں بھی رضائے الٰہی اور توجہ رسالتؐ کے اشارے ہیں:

تقدیر پہ چھوڑا ہے اس ناقہ ہستی کو
یہ کعبہ ہے وہ طیبہ، دیکھیں تو کہاں ٹھہرے

سرشآر کی نعتیہ شاعری میں مضمون آفرینی نہیں، خیال آرائی نہیں بلکہ اب وہ اپنے بیتے ہوئے لمحوں کو اور آنے والے لمحوں کو اپنے لفظوں کے آئینے میں دیکھ رہا ہے اور دکھا رہا ہے اور اس میں اس کا کمالِ فن نہیں۔ ربِ محمدؐ نے ایسی افتادِ طبع، ایسا ذہن، ایسی نظر اور ایسا قلب عطا کیا ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے جذبۂ خیال اور خیال، جذبہ بن جاتا ہے۔ ویسے بھی قرآن حکیم نے قلب کو فکر کا مرکز قرار دیا ہے۔ یہ وہ مرحلہ شوق ہے کہ نظارے آواز بن جاتے ہیں اور آوازیں تصویریں بن کر دیوار ابد کی آرائش کا سامان کرتی ہیں۔ بڑی عشقیہ شاعری میں نغمہ دکھائی دیتا ہے اور منظر سنائی دیتا ہے۔ یہاں تمام حواس ایک دوسرے میں گم ہوکر ایک حسن بن جاتے ہیں۔ کسی کو پانے کی اور اپنے آپ کو گم کرنے کی حس۔ لفظ اپنی سطح سے بلند ہوکر کسی کے نقش پا کے ذروں میں مل جاتے ہیں اور بیان واظہار کے ایک نئے آسمان کی تخلیق کرتے ہیں۔ میں نعتوں کی اس دنیا میں تھک گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے ان اشعار کی قرأت کے دوران وہ کچھ عطا ہوا ہے کہ میں اسے بہت دیر تک سہار نہیں سکتا۔ شاعر پر نہ جانے کیا بیتتی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ اس تحریر میں نعت گوئی کے سلسلے میں چند اشارے پیش کرنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اب لیجئے انتخاب (مختصر سے انتخاب) کی صورت میں اپنا حقیقی تبصرہ پیش کرتا ہوں۔ اس تبصرے میں حمد بھی ہے اور نعت بھی:

ان فضاؤں میں یہ کھلا مجھ پر
سانس لیتی ہے اب بھی سچائی

یوں بلایا ہے تو بھردے یہ مرا کاسۂ دل
کاسۂ دل جسے اب صاحبِ نسبت لکھوں

اپنے شایاں کوئی اک شعر عطا کر یارب
زندگی بھر یہی تکرار سعادت لکھوں

طواف کعبہ میں تھی کس کے نقش پا کی تلاش
خدا کا نام لیااور اسے پکار آیا

دور سے گنبد خضریٰ دیکھ کے، دل اس طور سے دھڑکا تھا
روح کے گہرے سناٹے میں جیسے شور نشور ہوا

میں نے اپنا چہرہ خود ہی بگاڑا تھا
اک صورت گر میری شکل سنوار چلا

تہذیب التجا مجھے تعلیم کر، کہ میں
دربار مصطفیٰؐ میں سوال کرم کروں

یہ دل ہے یاد رسالت مآبؐ سے معمور
متاع کون ومکاں کاسۂ فقیر میں ہے

مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ نے اپنی کتاب ''دستور حیات'' میں دین کی بنیادوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''انبیائے کرام پوری انسانیت کے لئے اسوۂ کامل، اعلیٰ قابل تقلید نمونہ اور اخلاق، ذوق ورجحان، ردوقبول اوروصل وفصل کے باب میں سب سے مکمل اورآخری معیار ہوتے ہیں۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق ہے وہاں اس پہلو پر اور زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات کے ساتھ صرف ضابطہ اور قانون کا تعلق کافی نہیں، روحانی اور جذباتی تعلق ایسی گہری اور دائمی محبت سے مطلوب ہے جو جان ومال ،اہل وعیال کی محبت پر فوقیت لے جائے۔''

سرشار کی نعت تخلیقی سطح پر اسی حقیقت کی توثیق بھی ہے اور اس کے احوال کا اظہار بھی:

حاضر ہوئے تھے زیست کی محرومیوں کے ساتھ
لوٹے تو یہ عذاب وہیں چھوڑ آئے ہیں

اب سرشار اسی تعلق کی بناء پر جنت مدینہ کی شہریت حاصل کرچکا ہے۔ خدا کرے یہ شہریت دائمی ہو۔

(میثاق/ سرشار صدیقی،۲۰۰۲ء، حرا فاؤنڈیشن، کراچی)

کوثری نغموں والا

میں نے حفیظ تائب کو کوثری نغموں کا شاعر نہیں کہا' بلکہ کوثری نغموں والا کہا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ کوثری نغمے ان کے وجود کا حصہ ہیں اور ان کی نعت گوئی پورے وجود کی شاعری بلکہ اظہار ہے۔ خواجہ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی ان کی شناخت بن گئی ہے۔ اس سے بڑا اعزاز کسی کو اور کیا حاصل ہوسکتا ہے۔

کوثریہ کا مسودہ ملا۔ اس میں حفیظ تائب صاحب کا خط رکھا ہوا تھا۔ بے تابی کے ساتھ اسے پڑھا اور اداس ہوگیا' مگر جب حفیظ بھائی کا چہرہ نظروں کے سامنے آیا تو یہ اداسی اطمینان میں بدل گئی۔ حفیظ بھائی نے اپنی شدید علالت کے ساتھ تیرہ چودہ سال جیسے گزارے ہیں اس نے انہیں جیتے جی نفس مطمئنہ کے درجے تک پہنچادیا ہے اور یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے کہ یہ دنیا ہی ان کے لئے ان کے رب کی جنت بن گئی جس میں وہ اپنی جھکی ہوئی نگاہوں' ہونٹوں کے نیم تبسم اور مودب وادب دیدہ وچشیدہ آواز اور لہجے کے ساتھ زندہ ہیں اور اس طرح کہ اس جنت کی حدود لاہور سے دیارِ رسولؐ تک پھیلی ہوئی ہیں اور کون سے مقام اس جنت میں شامل ہیں اس کی خبر ان کے رب کو ہی ہے یا اس کے رسولِ اعظم ﷺ کو۔

میں نے کوثریہ کا ایک صفحہ کھولا اور یہ شعر سامنے آ گیا:

ان دوریوں کو رنگِ حضوری عطا کریں
ہمت سفر کی اب نہیں باقی غریب میں

اور دس بارہ برسوں کے دوران رمضان المبارک کے وہ بیتے ہوئے دن نظروں کے سامنے سے گزر گئے جو ہم نے مدینہ منورہ میں تائب صاحب کے ساتھ گزارے ہیں۔ عجب بات یہ ہے کہ مسجد نبویؐ میں ہماری ملاقاتیں کم ہوتیں' نہ ہونے کے برابر' مگر حرمِ مصطفوی سے واپسی پر جب ہم ایک دوسرے سے ملتے تو ایک دوسرے کی آنکھوں میں پورے دن کی روئداد پڑھ لیتے۔ تائب صاحب کی نزاکتِ احساس کا یہ عالم ہے کہ وہ مجھ سے مسجد نبویؐ میں اس لئے نہ ملتے کہ وہاں میری کیفیات اور واردات میں مخل نہ ہوں۔ یہ سبب ایک مرتبہ انہوں نے خود بیان فرمایا۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ اپنے آبگینۂ دل کی موج سامانیوں کو چھپانے کے لئے دوسروں سے دور رہتے ہوں گے۔

میں اور وہ دونوں ملازمتوں سے سبک دوش ''لوگ'' ہیں اور اس ملک میں ریٹائرڈ لوگوں کی حالت کس پر آشکار نہیں ہے۔ سچ مچ ہر سال طیبہ کے سفر کے لئے سروسامان مہیا ہوجانے کے راز سے ہم خود واقف نہیں۔ یہ اللہ کا کرم او سرکارِ دوعالم ﷺ کے التفات کا اشارہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے اپنے سفر کے بارے میں ہمارا یہ گمان حقیقت ہو۔ تائب صاحب اسے شہرِ رحمت سے اپنی دل بستگی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں:

بے سروسامانیوں میں حاضری ہوتی رہی
شہرِ رحمت سے مری دل بستگی کام آ گئی

مکان کو تو مکین سے شرف حاصل ہوتا ہے' سو میں نے بات کا سلسلہ مکینِ شہر رحمت ﷺ سے ملا دیا۔ زندہ رہنے کے کیسے کیسے جواز ان کی نسبت عطا کرتی ہے۔ گزشتہ سال رمضان میں' میں شدید بیماری کے اثرات سے پوری طرح صحت یاب ہوئے بغیر شہرِ رحمت کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ بڑی بات یہ کہ خدائے محمد ﷺ نے اتنی توانائی عطا فرمائی کہ کسی درجے میں وہاں حاضری کا حق ادا ہوگیا۔ حفیظ صاحب کا یہ شعر میرے سفر کی روئیداد ہے:

طیبہ کی سمت میں نے جو قصدِ سفر کیا
طاقت کہاں سے آ گئی جسمِ نحیف میں

قارئین کرام !

میں حفیظ تائب اور ان کی نعت گوئی پر کوئی رسمی وادبی تنقید نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی نعت گوئی کی تنقید تمام تنقیدی شرائط کے باوجود صرف ضابطے کی کاروائی نہیں ہوسکتی۔ اور آپ کے شاعر سے راقم الحروف کا رشتہ بھی عجیب ہے اس رشتے کے تاروپود مدینے کے شب وروز دل کی دھڑکن اور آنسوؤں کی شبنم سے بنے گئے ہیں۔ میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ بات تو واضح ہوجاتی ہے کہ گفتۂ حفیظ تائب میری اور میری طرح ان کے کتنے ہی پڑھنے والوں کی داستانِ جذبات ہے۔کسی شاعر کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہوسکتی ہے۔ لذتِ گفتار کا اس سے زیادہ بامراد حاصل اور کیا ہوسکتا ہے کہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔''

جناب حفیظ تائب نعت گوئی کی شرائط سے خوب باخبر ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ ان شرائط کو پورا بھی کرتے ہیں:

نعت گوئی کے لئے حسنِ ارادت شرط ہے
ساتھ کچھ فہمِ کتاب وعلم سیرت شرط ہے
اس میں ہے لازم جمالِ فن بھی اوجِ فکر بھی
جتنی ممکن ہو خیالوں کی طہارت شرط ہے
گرادب پہلا قرینہ ہے ثنا کے شہر میں
ہر قدم اس راہ میں عجزِ طبیعت شرط ہے

تائب صاحب کے وجود کی مٹی حسنِ ارادت سے گوندھی گئی ہے۔ وہ صاحبِ علم بھی ہیں۔ اللہ کی کتاب کے اوراق میں انہوں نے صورت وسیرت خیرالبشرﷺ کی تلاوت کی

ہے۔ ان کی نعتوں میں جگہ جگہ قرآنی جواہر پارے اور ان کی طرف اشارے موجود ہیں۔ جمالِ فکر کی مسلسل جھلکیاں ان کی نعتوں کی ردیفوں' قافیوں' زمینوں میں ملتی ہیں۔ بیشتر نعتوں کے مصرعے دوہم آہنگ اور مساوی اجزا پر مشتمل ہیں۔ یہ نغمگی کلمہ طیبہ کے آہنگ سے پیدا ہوئی ہے۔ تائب صاحب نے کتاب وسیرت کے علاوہ عربی' فارسی' اردو اور پنجابی زبانوں میں محسنِ کائناتﷺ کے ادا شناسوں اور ان کے حسن کے باخبروں کی ''نظارگی'' اور ''نغمگی'' کو بھی اپنی دید اور اپنے نغموں میں یوں سمیٹ اور سمولیا ہے کہ وہ ان کی متاع اور فن بن گئی ہیں۔ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں(اقبال) گر ادب پہلا قرینہ ہے ثنا کے شہر میں (تائب) اور رہی بات اوجِ فکر کی تو جس کا جلال وجمال وسیرتِ بے مثال فکر کے نئے آفاق کی تخلیق کرتا ہوتواس کے بارے میں سوچتے رہنے والے کی فکر میں اوج ہی اوج ہوگا اور اس سارے سرمائے کے باوجود طبیعت کے انکسار اور عجز کو عنایتِ رب کے سوااور کن الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔حفیظ تائب کی مدح سرائی خواجۂ لطافت''حکمت اور اطاعت'' کے عناصر اس طرح اپنے دامن میں رکھتی ہے کہ وہ سرکار دوعالمﷺ کے ذکرِ جمیل کے ساتھ ساتھ قصہ احترامِ آدمیت بھی بن گئی ہے۔

فہمِ کتاب کے جلوے' کتنی ہی نعتوں میں جلوہ گر ہیں۔ ''سراجا منیرا'' شمس الضحیٰ 'بدر الدجیٰ وغیرہ تو کم وبیش بیشترشاعروں کے ہاں ملتے ہیں مگر تائب صاحب مطالعہ قرآن کو حیات وسیرتِ محمدﷺ سے ہم رشتہ کردیتے ہیں۔

ساعت ہر آنے والی ہے بہتر ترے لئے
تو کس لئے ملول ہے یاایہا الرسول

شعر پڑھتے ہی سورۃ الضحیٰ کی آیات ذہن کی وادیوں میں گونجنے لگتی ہیں۔ شاعر کی احتیاط اور نکتہ سنجی یہ ہے کہ اس نے رسول سے تخاطب کا پیرایہ برقرار رکھا ہے اور

یاایہاالرسول قرآنی اسلوب کا نقشِ معنوی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ جل جلالہ نے نام لے کر ختم الرسلﷺ کو کہیں مخاطب نہیں فرمایا ہے۔ یہ اعزاز، مرتبہ محمدی کی طرف اشارہ ہے۔ سخت ترین حالت میں ہادی اعظم کو تسلی دی جارہی ہے کہ تمہارا رب تمہارے ساتھ تھااور رہے گااور ''وللاخرة خير لک من الاولى۔''ﷺ (سورہ والضحیٰ۔ آیت ۴)

''ساعت ہر آنے والی ہے بہتر ترے لئے'' خدا کرے یہ تفسیر بالرائے نہ ہو اگر میں یہ عرض کروں کہ بہتر ساعت کا شمار تاقیامِ قیامت ہوتا رہے گا۔ ہر آنے والا دن میرے زندہ رسول کے لئے اور ان کے پیغام کے لئے بہتر ہوتا جائے گا کیونکہ رسالتِ محمد ابد تک کے لئے ہے۔

تائب صاحب قرآنِ عظیم کا مطالعہ ایک زندہ کتاب کی طرح کرتے ہیں اور اس کی تعلیم، پیغام اور نکتوں کو نعتیہ شعروں کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں ہمارا ذکر ہے۔

لقد انزلنا اليكم كتبا فيه ذكر كم افلا تعقلون . (سورہ الانبیا۔آیت ۱۰)

''ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔ کیا تم یہ بات بھی نہیں سمجھتے ؟''

قرآن ہمارے لئے وہ کتاب ہے جس میں ہمارے مسائل، ہمارے کوائف، ہماری داخلی اور خارجی زندگی کی ہر کیفیت کا حال موجود ہے اور جو ہم پر اپنے رسولؐ سے ہمارے رشتے کو واضح کرتی ہے اس رشتے کا ایک نہایت اہم پہلو ان الفاظِ قرآنی میں سمٹ آیا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

ولو انهم اذ ظلمو انفسهم جاء وک فاستغفرو الله واستغفر لهم الرسول لوجد والله توابا رحيما. (سورۃ النساء: آیت ۔۶۴)

''اور جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو اگر وہ آپ کے پاس آجاتے اور اللہ

سے معافی طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتا تو یقیناً اللہ کو معاف کردینے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔''

سورۃ النساء کی اس آیت اور اس سے قبل کی آیات کی شانِ نزول کے سلسلے میں ایک سے زیادہ واقعات مستند روایات میں بیان کئے گئے ہیں اور ان روایات کا استعارہ اور تجسیم ستونِ توبہ کی شکل میں آج بھی مسجدِ نبویؐ میں موجود ہے اور رسول اللہﷺ کی دعائے مغفرت کی بات جاری وساری ہے۔ آیت سے یہ ضابطہ سامنے آتا ہے کہ جس کے لئے رسول اللہﷺ دعائے مغفرت فرماتے، اس کی مغفرت لازماً ہوجاتی۔ رب العزت کے ہاں اس کے حبیبؐ کے جو مقامات ہیں یہ ان میں سے ایک ہے اور اب آپ کے روضۂ مبارک پر حاضری دینے اور آپ سے اپنے حق میں دعائے مغفرت کرانے والوں کے لئے بھی یہی حکم اور ضابطہ ہے۔ رسول رحیم وکریم کی تدفین کے تیسرے دن ایک بدوی آپ کے مرقد پر حاضر ہوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، غم کے مارے سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ آیت پڑھی اور روتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور مغفرت کی دعا کا طالب ہوں۔ سننے والوں نے سنا کہ روضۂ اقدس سے آواز آئی۔

قد غفرلک۔ اے مانگنے والے! تیری مغفرت کردی گئی اور آج بھی یہی صدا حفیظ تائب کی نعت میں سنائی دے رہی ہے:

معافی مانگتا ہوں اپنے آقاؐ کے وسیلے سے
میں اپنی جان پر جب بھی کوئی بیداد کرتا ہوں

''نفس'' کے لئے جان اور ظلم کے لئے بیداد کیسے مناسب لفظ ہیں اور قرآن مفہوم کو کس طرح توانائی اور صحت کے ساتھ ادا کر رہے ہیں۔

اس شعر میں بھی قرآنی حوالہ روشن روشن اور جگ مگ جگ مگ نظر آرہا ہے:

جو پہلے دن سے حسنِ عمل پر ہے استوار
وہ یادگارِ شاہ زمنؐ مسجدِ قبا

حفیظ تائب صاحب کے نعتیہ کلام میں نظموں کی تعداد کم نہیں، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی اکثر غزل پیکر نعتوں میں بھی تسلسل ملتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ نعت میں سوچتے ہیں، ان کی آنکھیں جو مناظر دیکھتی ہیں ان کا تعلق بھی شاہِ دوسرا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور حیات سے ہے اور ان کے لبوں سے بے ساختہ یہ دعا بلند ہوتی ہے:

ہر یادگارِ خواجہ ارض وسما کی خیر

مدینہ ان کے لئے شہر ہونے کے ساتھ ساتھ معیت رسولِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ہے:

قلب ہے پرسکوں آپ کے شہر میں
للہ الحمد ہوں آپ کے شہر میں

یہ شہران کے زندہ نبی کا شہر ہے، ہر ذرہ زندہ نبی کے نور سے روشن اور زندہ ہے:

اس کی رحمت پہنچتی ہے سب خلق تک
سب پہ ہے مہرباں میرا زندہ نبیؐ

اس زندہ نبی کا انسان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے عبد کو معبود سے ملادیا۔ اس نے ہمارے سجدوں کو ایک مرکز عطا کردیا اور اس کی تلاش میں لفظوں کو زندگی مل گئی اور لفظوں کے صدف، معانی کے گوہر کے امین بن گئے۔ حفیظ تائب کی حمدیہ شاعری پائیدار سے ناپائیدار کے عشق کے لامحدود امکانات کو پیش کرتی ہے۔ یہ آب جو کی کوشش ہے کہ وہ محیط بے کراں سے ہم کنار ہوجائے اور پھر ہم کناری اور بے کناری کے درمیان ایک تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی کو مقام عبدیت اور مقام سجدہ کہتے ہیں۔ قرآنِ

عظیم میں صاحبِ معراج صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا دو مقامات پر ذکر ہے اور دونوں جگہ یہ ذکر آیاتِ سجدہ سے پیوستہ ہے۔ یہی سجدہ خدا سے بندے کو ہم کلام بھی بناتا ہے اور دل کا مکین بھی:

اپنے قرب ِ خاص کا راستہ بتادیا
دے کے سجدے کا پیام یا عزیزُ یا سلام
اس کرم کا کرسکوں شکر کس طرح ادا
دل میں ہے ترا قیام یا عزیزُ یا سلام

سجدے کے پیام اور دل میں قیام کے سلسلے میں اسماء الحسنٰی میں سے عزیز اور سلام کا انتخاب تائب کی سلامتی طبع اور اپنے رب سے قربت اور اس کی شانوں کی تفہیم کا ثبوت ہے۔ اللہ عزیز ہے کہ ہر قوت، ہر غلبے اور ہر بلندی کے ساتھ ساتھ ہماری اور کائنات کی ہر حفاظت اسی ذات سے ہے۔ اس سے قربت کا مقام سجدہ ہے اور یہ سجدہ مقامِ عزت ہے جو انسان کو ہر مغلوبیت سے بچالیتا ہے۔ اسی طرح سلام ہمارے تحفظ کے ساتھ ہمارے دل ودماغ اور ماحول کی سلامتی کا باعث ہے۔ وہ ہمیں بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ سُلم سیڑھی کو کہتے ہیں۔ ہم سجدے کی سیڑھیوں کے ذریعے مقامِ عبدیت پر فائز ہوجاتے ہیں اور پھر یہ کہنے کا لطف آتا ہے کہ:

مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ان سطور کو لکھتے ہوئے ذہن میں خیال آیا کہ جس بارِ امانت کے اٹھانے سے فرشتے گریزاں تھے اور جسے انسان نے اٹھالیا، اظہار بھی اس بارِ امانت کا حصہ ہے اور انسان جب سے اب تک اظہارِ مدعا کے لئے لفظوں کو مسخر کررہا ہے اور نت نئی ترکیبیں تراش رہا ہے۔ خالقِ کائنات نے فرمایا ہے کہ میں نے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے مسخر کردیا ہے۔ اس سب کچھ میں الفاظ بھی شامل ہیں۔ حفیظ صاحب الفاظ

کو مسخر کر رہے ہیں اور یہ توفیقِ خداوندی ہے۔ حمد و نعت بھی توفیقِ خداوندی ہیں۔ یہ بھی زندگی کا عجب نکتہ ہے کہ چیزیں ایک دوسرے سے کس درجہ جڑی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان ربط کا سبب ان کے خالق کا وجود ہے۔ یہ نظریہ کائنات اور زندگی کی وحدت کو آشکار کرتا ہے:

ہر موجِ نفس اس کی عنایات پہ شاہد
ہر رنگِ سحر اس کی صداقت کا حوالہ

اجرامِ فلک ہوں کہ نباتات وجمادات
ہر چیز سمجھتی ہے اشاراتِ الٰہی
آفاق در آفاق ہیں انوار اسی کے
امکان در امکان نشاناتِ الٰہی

حفیظ تائب کی آنکھ ہر لمحہ نشاناتِ الٰہی کو دیکھنے کے لئے بیدار ہے۔ ''ہر رنگِ سحر'' پر غور فرمائیے۔ اللہ کے اس نگار خانے میں تکرار کہیں نہیں۔ ہر صبح بالکل ایک نئی تخلیق ہوتی ہے۔ اپنے سے پہلی اور بعد میں آنے والی صبح سے الگ، ہر صبح کائنات جیسے نئے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ کل یوم ھو فی شان۔

اس نعتیہ مجموعے کا نام ''کوثریہ'' ہے۔ اس نئی اصطلاح کی وضاحت حفیظ تائب کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

''سہ مصرعی نظم پاروں کو کچھ اختلاف کے ساتھ ثلاثی، ہائیکو اور ماہیا بھی کہا گیا ہے مگر میں نے نعتیہ سہ مصرعی نظم پاروں کو سورۃ الکوثر کے تتبع میں تینوں ہم قافیہ اور ہم وزن مصرعوں کی صورت دے کر ''کوثریہ'' کا نام دیا ہے۔''

ہائیکو، ثلاثی اور ماہیا کے فرق اور ان کی خصوصیات پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں،

ثنائے رب العالمین اور نعتِ صاحبِ کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہمارے شعراء ہائیکو کو استعمال کر رہے تھے مگر یہ شرف حفیظ تائب کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ وہ سورہ کوثر کے جاوداں اور ربانی آہنگ کی بنا پر اردو میں ہائیکو کی عام روایت کو ایک نیا رُخ عطا کر کے نئی صنف سخن ایجاد کریں۔ تین مصرعوں کی رمزیت اور اختصار اسی صورت میں ابھر سکتا ہے جب زبان و بیان کے امکانات شاعر کے دائرہ اختیار میں ہوں:

جلوہ الکتاب دیکھا ہے
روئے رحمت مآب دیکھا ہے
کس زمانے کا خواب دیکھا ہے

روئے رحمت مآب تخلیق کا نقطہ آغاز ہے، کتنے زمانے اس جلوے کی تابانیوں میں گم ہیں۔ تین مصرعوں کی اس نظم میں تائب صاحب کی دید اور ہماری تمنائے دید، دونوں چیزیں سمٹ آئی ہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ خوشبوئے مدینہ سے لدی ہوائیں لاہور میں حفیظ تائب کے مسکن تک آئیں اور ان کے لئے پیامِ شفا بن کر آئیں۔ تائب کی نعتیں ہمارے لئے نسخہ بصیرت ہیں اور ان کو پڑھ کر آنسوؤں کے آبِ رحمت سے ہماری آنکھیں دھل کر اس طرح روشن ہو جاتی ہیں کہ ہر منظر مدینہ کا منظر بن جاتا ہے، آسمان چمکنے لگتا ہے اور ماحول درود کی خوشبوؤں سے مہک مہک جاتا ہے۔ خداوندا! اس نغمہ حجازی کے نغمہ گر کو شفا اور توانائی عطا فرما۔

(کوثریہ/ حفیظ تائب، ۲۰۰۳ء، القمر انٹر پرائزز، لاہور)

کیفِ نعت و سلام

جناب سید محمد حنیف اخگر ملیح آبادی نئی دنیا میں اردو کے زندہ نشان کی حیثیت رکھنے کے ساتھ ساتھ پاکستانیت اور اسلامی طرز حیات کی ایک علامت بھی ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے کراچی کی ایک تقریب میں جس طرح نعتِ حضرت خیر البشرﷺ پڑھی اس سے جگر صاحب اور ان کے ہم عصر شعراء کا دور جیسے زندہ ہوگیا۔

اخگر صاحب غزل کے ایک مستند اور معتبر شاعر ہیں اور اب ان کی حمد و نعت کا مجموعہ شائع ہونے جارہا ہے۔ اخگر صاحب کی غزلوں میں بھی ان کے روحانی سفر کی جھلکیاں ملتی ہیں، لیکن زیرِنظر مجموعہ "خلقِ مجسم" ان کے نورانی باطن کا منظر نامہ ہے۔

نعت گوئی کے اس انتہائی تابناک دور میں بھی اچھی حمد یہ شاعری کم نظر آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ان دیکھے خدا کو اپنی شہ رگ سے بھی قریب محسوس کرنے، اسے ہر نظارۂ کائنات میں دیکھنے اور قرآن حکیم کی آیات میں اس کی آواز کو سننے کے لئے ایماں، احساس اور ادراکیت کی جو سطح درکار ہے وہ بغیر اس کی توفیق کے انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس رب ذوالجلال کا فیضان تو عام ہے۔ لیکن اس کا عرفان عام نہیں۔ الحمداللہ! اخگر صاحب کو یہ دولت کم یاب بلکہ نایاب حاصل ہے۔ خالق کائنات نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی ہے:

تو مجھے اپنی تمنا کی عطا کر توفیق
اور مری عرض تمنا کو پذیرائی دے

ان کے نعتیہ کلام میں اپنے رسولﷺ کے لئے ان کے ایک امتی کی بے پایاں محبت کے ساتھ شعری محاسن بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ بعض نئی تراکیب ایسی خوبصورتی اور بے ساختگی کے ساتھ ان کی نعتوں میں آگئی ہیں کہ تحسین کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے:

اے چراغ عزم طیبہ مرحبا
راستے روشن نظر آئے بہت

ایسی نئی تراکیب نئے اندازِ نظر اور طرزِ فکر کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔

ان کی نعت گوئی عقیدت کی ایک وسیع دنیا ہے جس میں ان کے شب و روز حضرت رسالت مآبﷺ کے دوسرے مغنیوں کے ساتھ گزر رہے ہیں:

رقصاں تھے سبھی رند وہ حافظ ہوں کہ سعدی
دور مئے عرفاں تھا جہاں، میں بھی وہیں تھا

اب نعت و سلام ہی اخگر صاحب کی دنیا ہے۔ میں بھی ان کی اس دعا پر آمین کہتا ہوں:

تمام عمر میں نعت و سلام لکھتا رہوں
تمام عمر اسی میں تمام ہوجائے

(خلق مجسم/سید محمد حنیف اخگر، ۲۰۰۳ء، دبستان وارثیہ، کراچی)

مقبول نقش کا نقشِ عقیدت

جناب مقبول نقش ہمارے ایک پختہ عمر، پختہ شعور اور پختہ فکر ادیب وشاعر ہیں۔ ان کی شعوری عمر کم وبیش ۶۲ سال ہے۔ انہوں نے زندگی کا حق ادا کیا ہے۔ ان کی زندگی کے دامن میں متنوع اور گوناگوں تجربے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کے ساتھ تعاون اور تعامل کا فریضہ انجام دیا ہے، وہ ایک ایسے دور کے فن کار ہیں جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے:

ہیں موڑ پہ صدیوں کے دن ایک مہینے کے

انہوں نے دوسری عالمی جنگ دیکھی ہے جب ہر چوبیس گھنٹے میں یورپ کا جغرافیہ بدل جاتا تھا۔ انہوں نے افریقا اور ایشیا کے بیشتر ممالک میں طلوع آزادی کا نظارہ کیا۔ انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے مسلمان ملک کو دنیا کے نقشے پر ابھرتے اور اسے دولخت ہوتے دیکھا ہے۔

گزشتہ چونتیس برسوں میں مقبول نقش صاحب کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کئی اصناف سخن میں انہوں نے اظہار خیال کی نئی گنجائشیں اور امکانات تلاش کئے ہیں۔ نظم کے مختلف پیکر، غزل، رباعی، قطعہ، ثلاثی، ہائیکو اور ماہیا...... ثلاثی، ہائیکو اور ماہیا گویا مقبول نقش صاحب کے ذہن میں ثلاثی، ہائیکو اور ماہیا الگ الگ اور مستقل اصنافِ سخن کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ ان کے درمیان بجا طور پر فرق کرتے ہیں اور اس فرق کو عملی طور پر برتتے ہیں۔

مقبول نقش صاحب کے مختلف شعری مجموعوں میں ان کی زندگی کے گزرے ہوئے ماہ وسال، ہماری گزشتہ صدی کے نقوش، تاثرات اور زندگی وکائنات کی جاوداں اور لافانی حقیقتیں موجود ہیں۔ مشرقی پاکستان کے مناظر، شعر کے پیکر میں ڈھل کر ایک انسانی تجربے کے طور پر محفوظ ہوگئے ہیں اور ان کی غزلوں میں آفاقی موضوعات کی نمود ہے اور حدیثِ دل ودنیا سنائی دیتی ہے۔

غنچہ سر شاخ کھل رہا ہے
خوشبو کو وجود مل رہا ہے
خواب بھی چھین لئے جائیں تو پھر کیا رہ جائے
آدمی اپنے خیالوں میں بھی تنہا رہ جائے
زندگی میں ایسے بھی حادثے گزرتے ہیں
روشنی کے دیوانے روشنی سے ڈرتے ہیں

یہ اشعار جدید غزل کے مزاج اور آہنگ کی نمائندہ مثالوں کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جدید غزل جو نئے انسان کی تنہائی، نئے انکشافات، نئی آگہی، بدلتے ہوئے سماجی حالات اور حالات کی کہر میں ڈوبے ہوئے اور کھوئے ہوئے ان خیالات، محسوسات اور کیفیات کی عکاس ہے، جو شاعر پر بھی پوری طرح واضح نہیں ہیں اور آج کی غزل میں پچھلے ساٹھ سال کے وہ واقعات پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے ہماری نسل دوچار ہوئی اور مقبول نقش صاحب اسی نسل کے باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ آزادی کے حصول کے وقت چراغاں ہوا اور یوں کہ جلتے ہوئے مکانات اور بستیوں کے شعلے آزادی کا چراغاں بن گئے:

زندگی میں ایسے بھی حادثے گزرتے ہیں
روشنی کے دیوانے روشنی سے ڈرتے ہیں

اور ایسے حادثوں کے بعد حساس لوگ اپنے خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں، لیکن ان خوابوں کا رشتہ حقیقتوں سے ہوتا ہے۔ زندگی کو سجانے کے خواب، تعمیر آشیاں کے خواب، زیتون کی ٹہنی اور امن کی فاختہ کے خواب ......اوراس کے ساتھ حسن سے وابستگی......خوشبو کی تجسیم کے لمحوں کو دیکھنے کا منظر۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ شاعر اور تخلیقی فن کار کا رشتہ ابدی، کائناتی اور مابعدالطبیعیاتی حقیقتوں سے بھی ہوتا ہے۔ یہ رشتہ زندگی کے سفر کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ رشتہ ہماری زندگی کی بلند تر سطح کا دوسرا نام ہے اور ہر مذہب وملّت کے شاعر اورفن کار کے ہاں اس رشتے اور تجربے کی نمود ہوتی ہے۔مسلمان فن کار کے ہاں یہ مابعدالطبیعیاتی تجربہ بھی انسانی اورعملی ہوتا ہے اور یہ رحمتہ للعالمین ﷺ کا کرم ہے۔ اللہ کو ان کے ارشادات اور ان پر نازل ہونے والی کتاب نے ہماری رگِ جاں سے قریب تر کردیا۔

مقبول نقشؔ صاحب کے تمام شعری مجموعوں میں حقیقت کا یہ پہلوموجود ہے:

میں خراب دشت طلب ترا
تو میرے قریب رگِ گلو

(حمد: ''حرف مری کائنات'')

ہم کشتہ وہم وگماں
تو رہبر راہِ یقیں

(نعت: ''حرف مری کائنات'')

دوام تجھ کو ہے لیکن ترا سراغ ہوں میں
ہوا کے سامنے جلتا ہوا چراغ ہوں میں

مری نظر کو، مری فکر کی رسائی دے
کہ مجھ کو چہرہ آئندہ بھی دکھائی دے

پچاس، ساٹھ سال کی سخن آرائی کے بعد جناب نقشؔ اپنا حمدیہ نعتیہ مجموعہ ''حرفِ ثبات'' پیش کررہے ہیں۔ یہ تعارفی تحریر اس جگہ بھی ختم ہوسکتی ہے کہ میں نے ان کو حمدیہ نعتیہ شاعری کے پس منظر اور ان کے اندازِ فکر سے متعلق کچھ اشارے آپ کی خدمت میں پیش کردیے اور ان کی شاعری پر اختصار سے کچھ باتیں عرض کردی ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ ان کی حقیقت نما شاعری کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے اور ذکرِ حبیب رب دوجہاں ﷺ کی سعادت حاصل کی جائے کہ روح کو منور اور معطر کرنے کی ایک قوی، موثر اوریقینی صورت یہی ہے۔

اس ہرآن بدلتی ہوئی دنیا میں صرف تغیر کو ثبات ہے اور اس میں اگر حرفِ ثبات، کسی لفظ، کلمہ اور کلام کو کہا جاسکتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسولِ آخرالزماں ﷺ کا ذکر ہے۔ جب ہر نقش مٹ جائے گا تو صرف اللہ کا وجود باقی رہ جائے گا اور روزِ قیامت تک ذکرِ محمد عربی ﷺ لبوں پہ جاری رہے گا۔ اس مختصر سے مجموعے میں حرفِ ثبات کے ذریعے انسان اورا سکے کلام کو دوام کی ایک صورت عطا کی گئی ہے۔مقبول نقش صاحب کے حمدیہ کلام میں اللہ صرف ''نقشِ خیالی'' نہیں بلکہ وہ روحِ حرف وکائنات کی طرح نظر آتا ہے۔ عہدِ حاضر میں نعت نے بے حد ترقی کی ہے لیکن اعلیٰ درجے کی حمدیہ شاعری کم ہی نظر آتی ہے۔ اس کے اسباب میں اک سبب یہ ہے کہ اللہ کو ہم ایک وجود کے طور پر محسوس نہیں کرپاتے اوراس کے کلام کے ذریعے اس تک رسائی کی کوشش نہیں کرتے اوراس کے رسولِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذکر میں اللہ کی حیات افروزی اور قدرت کاملہ کونہیں دیکھ پاتے۔مقبول نقش خوش بخت ہیں کہ احساسِ وجودِ الٰہی کی وہ نعمت انہیں حاصل ہوئی ہے جو ''دید'' کی سرحدوں کو چھولیتی ہے۔ وہ اپنے معبود سے سرگوشیاں کرتے

ہیں۔ ان کی دعاؤں میں اللہ سے ہم کلامی کی کیفیت ہے:

ترا ذکر اور تری گفتگو
مری کشت جاں کے لئے نمو
مری زندگی بھی تری طلب
مری موت بھی تری جستجو

ربِ ذوالجلال کو مقبول نقش نے اپنے شعور اور اپنے ایمان کی مدد سے اپنی زندگی کے ہر نفس کا حاصل، اپنی ہر نظر کی منزل بنالیا ہے۔ وہ زندگی کی راہوں کا ایسا مسافر ہے جس کا زادِ راہ اس کا خالق ہے وہ ذاتِ باری کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور اسی فکر مسلسل کے دریا میں نعت کے ایسے موتی ہیں جن کی آب وتاب دیدنی ہے۔ فکر کی گہرائی اور اسلوب کی ندرت وجدت اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں:

فکر مری شکستہ پا، ذکر ترا کروں تو کیا
واقعہ بعد ازاں بھی تُو، قصہ پیش تر بھی تُو

مقبول نقش کی حمدیہ شاعری میں بیشتر مقامات ہمیں اللہ سے تخاطب کی صورت کا پیرایہ نظر آتا ہے۔ نماز کو اللہ کے ساتھ مومن کی سرگوشی قرار دیا گیا اور نماز کا نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے روز وشب اللہ سے مخاطبہ اور مصاحبہ بن جاتے ہیں۔ یہ قربت اور ادراکِ خالق، اس کے محبوب اور آخری نبی ﷺ سے محبت اور قرآنِ حکیم کے مطالعے سے پیدا ہوتا ہے۔ آج کا مسلمان دنیوی عیش وعشرت اور دولت کی فراوانی کے بھنور میں پھنس گیا ہے اور عہدِ مصطفوی سے ہر دن دور تر ہوتا جارہا ہے لیکن سرکار دوعالم ﷺ سے وابستگی اس کی شناخت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے آج محمد رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش کے بعد کم وبیش ۱۴۷۶ھ سال گزر چکے ہیں۔ اس حساب کو پھیلایئے تو معلوم ہوگا کہ آج ہم عہدِ ختم الرسل سے سترہ ہزار سات سو بارہ مہینوں کی مسافت پر ہیں اور اس

عہد بابرکت کے بعد پانچ لاکھ اڑتیس ہزار، سات سو چالیس دن گزر چکے ہیں اور ہر دن یہ اعداد وشمار بدل رہے ہیں لیکن ذکرِ خیر الانام ماہ وسال کی ان گردشوں پر غالب ہے۔ دنیا کے ہر گوشے، ہر خطے اور ہر ملک میں ان کے ذکرِ پاک کا ترفع جاری ہے۔ **اللھم صلی علی محمد وعلی آلِ محمد** اور جناب مقبول نقش کا یہ مجموعہ حمد ونعت اسی بلندی ذکر واسم محمد کا ایک حصہ ہے۔ اللہ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ وہ بھی دوسرے اہلِ ایمان کے ساتھ اس رفعِ ذکر میں شامل ہیں:

بالائے ہر یقین و گماں، آپ کا خیال
وجہ نمود کون ومکاں، آپ کا خیال
کیا غم اگر ہے تیز بہت زندگی کی دھوپ
ہے سایہ ردائے اماں آپ کا خیال

حرفِ ثبات کا مطالعہ اس سایہ ردائے اماں میں قیام کی طرح ہے۔ میں بھی اپنے آپ کو اس منزل پر ان کے خیال میں گم کرتا ہوں اور آپ بھی ان نعتوں کا مطالعہ کریں جو آپ کو دیارِ محبت میں پہنچادیں گی۔ میرا یہی جملہ ان نعتوں پر میرا حرفِ نقد ہے۔

(حرفِ ثبات/ مقبول نقش، ۲۰۰۴ء، ہم سخن رائٹرز فورم، کراچی)

کشتیٔ عشق کا ساحل، طیبہ

آج اسلام کو لوگ اپنی تنظیموں، اپنے رسالوں، اپنے جتھوں میں مقیم بتاتے ہیں۔ کبھی اسلام دلوں میں مقیم تھا۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ہمارے ہر محلے میں ایسے بزرگ نظر آتے تھے کہ آنکھ ان کے چہروں سے ہٹتی نہیں تھی۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ میں ہر آدمی کے لئے خوش آمدید کی تحریر لکھی نظر آتی، آنکھوں میں محبت کا دیا روشن نظر آتا، لہجے کی نرمی جیسے سننے والوں کے دلوں کے ہر زخم اور دکھ کا مداوا ہوتی۔ ان لوگوں کی دید اس حدیث گرامی کے مفہوم کی تفسیر ہوتی کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔

ان دنوں ہوا میں کثافت نہیں تھی اور ایسا معلوم ہوتا کہ فضاؤں میں روشنی، ہوا، پھولوں کی خوشبو اور آکسیجن کے علاوہ کوئی اور شے بھی شامل ہے جو تمام عناصر کی شیرازہ بندی کررہی ہے۔ ان دنوں اس چیز کا نام معلوم نہ تھا اور اب اس کے نام کی خبر ہوئی ہے۔ یہ وہ روحانیت تھی جو اللہ تعالیٰ کی تحمید وتمجید اور ذکر سے اور محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذکر اور درود سے پیدا ہوتی ہے۔ اب زندگی کے قرینے بدل گئے ہیں، مکے مدینے کے ذکر کی جگہ ''گھڑی پہ چوہا ناچا'' نے لے لی ہے۔ ابھی سورج طلوع بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے بچے اپنے ہم وزن بستے اٹھائے ہوئے اسکول کی بس میں بیٹھ جاتے ہیں اور سوتے جاگتے اسکول پہنچ کر ''معلومات'' کے حصول میں غرق ہوجاتے ہیں۔ اب بچوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ ''تاروں بھرے آسمان، رنگ برنگے پھول، ان کی مہکار، تازگی،

لمس، شفق، شام، قوسِ قزح، بیر بہوٹیوں، تتلیاں، چھوٹے بڑے خوش رنگ پرند، پھولوں کی نازک پنکھڑیوں پر ٹھہری شبنم کی بوندوں'' کو دیکھیں، دیکھتے رہیں اور پھر بغیر الفاظ کے ''اللہ کی تعریف'' کا پودا ان کے دلوں کی زمین میں جڑ پکڑ لے اور ان کے ساتھ بڑھتا چلاجائے اور اس میں برگ وبار آئیں اور اس کے پھولوں کی خوشبو زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے ساتھ رہے۔

واوین میں، میں نے جو لفظ پیش کئے ہیں وہ رشیدہ عیاںؔ کے خوابوں کی تمہید سے لئے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی کے ماہ وسال اسی کیفیت میں گزارے اور یہی حقیقتیں، تمنائیں اور تقاضے ان کے خوابوں میں ڈھلتے رہے اور پھر انہیں ان خوابوں کی تعبیر بھی مل گئی۔ یہی خواب اب الفاظ میں جلوہ گر ہو کر ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

بچپن میں اللہ جل جلالہ کی جو بے الفاظ حمد ان کی آنکھوں میں بستی تھی اور خوابوں میں جاگتی تھی۔ جب ان پر اپنی ذات منکشف ہوئی تو لفظوں میں آسودگی پاگئی اور نبی محترم ومحتشم کے احسانات کے اطراف وجوانب ان کی ذات پر چھاگئے۔ ان دونوں (حمد ونعت) کے درمیان عجب رشتہ ہے۔ مسلمان، رسول ﷺ کے توسط ہی سے رب شناسی کے حقیقی معانی سے آشنا ہوتا ہے۔ یوں تو پوری کائنات ذاتِ باری تعالیٰ کا صحیفہ ہے مگر اس کی ذات ومعانی کے بارے میں ہم وہی کچھ جانتے ہیں جو اس نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعے ہمیں بتایا ہے۔ سلام ودرود اس کی ذات پر، اس کی آل پر، اس کی ازواج پر، اس کے اصحاب پر اور قیامت تک اس کی امت پر، وہ جو ہمارے لئے کائنات وذات کشا ہے اور وہ جس کی ذات قبلہ نما ہے۔ وہ ذات جس کی معرفت ہمیں یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ہمارا رب ہم سے، ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر ہے۔

رشیدہ عیاںؔ نے اپنی فکر کی حیرانی، اپنے سکوتِ لب اور اپنی محوِ جمال آنکھوں کے

ساتھ اپنے رب کی بارگاہ تک رسائی حاصل کی۔ اپنے معبود سے ان کا رشتہ اس شعر میں سمٹ آیا ہے:

فکر حیراں ہے، زباں گنگ، نظر محو جمال
روز اول سے یونہی بیت رہے ہیں مہ وسال

ہر اچھے مسلمان کی طرح رشیدہ عیاںؔ کی زندگی میں رسولﷺ کی زندگی اور اسوۂ حسنہ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ کہیں گہری، کہیں مدھم اور انحراف کی صورت میں بھی سوئے رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مراجعت کی تمنا اور کوشش۔

رشیدہ عیاںؔ کے خوابوں سے اپنے رسولﷺ سے ان کی نسبت کی کہانی کے کچھ پہلو آپ کے سامنے آئیں گے اور باقی پہلو ان کی نعتوں میں ہیں۔ ان پہلوؤں میں گنبدِ خضریٰ کا سبز اور زندگی بخش وحیات افروز رنگ بھی ہے، روضۂ پاک کی جالیوں کا عکس بھی ہے اپنے وجود کی سلامی کا ذکر بھی ہے اور اس حیرت کا اظہار بھی کہ میں کن اور کیسے مقامات سے گزر آئی ہوں۔ مسجد نبوی اور روضۂ رسول اکرمﷺ کی زیارت تاریخ کو ہمارا تجربہ اور احوال بنا دیتی ہے اور ہم اپنے وجود کو کائنات پر پھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسولﷺ اور مختلف ستون کیا کچھ یاد دلاتے ہیں۔ جدید نعت میں ایک نوع کی گستاخی بھی ہے کہ نعت گو شاعر اپنے آپ کو حضرت حسانؓ کا ہم زبان بلکہ ہم نوا اور ہم رتبہ قرار دیتے ہیں اور ایسے جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر ہم عہدِ حضرت رسالت مآبﷺ میں ہوتے تو کیا کچھ نہ کرتے۔ ''ایک زمانہ'' مجھ پر ایسا بھی گزرا ہے کہ ایسی نعتیں بہت پسند آتی تھیں مگر مسلسل تامل اور فکر سے مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ ایسے نعت گو تو آج بھی اپنی زندگی پر نظر نہیں ڈالتے۔ شریعت وراہ مصطفوی سے انہیں عملاً کوئی علاقہ نہیں اور دعوے ''عشق رسول'' کے۔ حبِ رسول کا بہترین اور واحد ثبوت اتباع رسولﷺ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی صف میں شامل ہونے کی تمنا کا اظہار

کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ انبیائے عظام علیہم السلام کے علاوہ سورج اصحاب محمدﷺ سے بہتر کسی جماعت پر طلوع نہیں ہوا۔ لیکن اس عہد میں ہونے کی تمنا بھی کبھی کبھی ہماری روح کا تقاضا بن جاتی ہے۔ رشیدہ عیاںؔ بھی تمنا کے اس عظیم تجربے سے گزری ہیں مگر کس طرح:

کونین کے سرورؐ جس پہ کھڑے ہو کر خطبہ فرماتے تھے
نعلین کا جس کو لمس ملا ہے کاش وہ پتھر میں ہوتی
وہ کتنا افضل و اعلیٰ تھا، وہ کتنا قسمت والا تھا
جو پیٹ پہ حضرتؐ نے باندھا، اے کاش وہ پتھر میں ہوتی

یہ ہے سچی تمنا اور یہ ہے محبت کی وسعتوں کا ایک رخ۔ آج بھی چودہ پندرہ صدیوں کی مسافت پر مدینے کے مسافروں کو مدینہ منورہ کے ذروں میں سورج چمکتے نظر آتے ہیں۔ مرغ وماہی کھاتے ہوئے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، ہاتھ رک جاتے ہیں اور نوالہ منہ تک کا سفر طے نہیں کر پاتا۔ یہیں وہ شہنشاہ اعظمﷺ آسودہ خاک ہے اور ہمارے اعمال کا نگراں ہے جس کے گھر میں مسلسل دو تین دن کھانا نہیں پکا۔ جس کا ارشاد تھا، میں چاہتا ہوں ایک دن کھانا کھاؤں اور ایک دن فاقہ کروں تاکہ بندہ شاکر ہونے کے ساتھ ساتھ عبدِ صابر بھی بنوں۔ رشیدہ عیاںؔ کو جو بار بار امت کے رسول اور دلبرﷺ کے شہرِ خنک میں جانے کی سعادت ملی اور مدینے کے جو جلوے آنکھوں نے دیکھے اور وہ جذبہ بن کر دل میں ٹھہرے، پھر عیاںؔ نے ان کو شعر کا قالب عطا کردیا۔

رشیدہ عیاںؔ کی بیشتر نعتیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہر تجربہ ایک شعر بن گیا اور اس طرح غزل کے پیکر میں لکھے جانے والے اشعار ہماری گفتگو کا حصہ بن جاتے ہیں اور موقع پاتے ہی ذہن سے ابھر کر گفتگو کی سطح پر آجاتے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ اور معتبر نقاد نے نعت میں ہیئت اور تجربوں کی ضرورت پر زور دیا

تھا۔ شاعروں اور فن کاروں سے ایسے مطالبات کوئی جواز نہیں رکھتے۔ نظم کی مختلف ہیئتوں سے جن شعراء کو دلچسپی ہے انہوں نے ان ہیئتوں اور اصناف میں نعتیں لکھی ہیں۔ عبدالعزیز خالد، عمیق حنفی، حفیظ تائب، مظفر وارثی، چودھری ریاض حسین...... یہ چند نام لکھتے لکھتے یاد آ گئے۔ ان دنوں نعتیہ ہائیکو کی بہار آئی ہوئی ہے اور حفیظ تائب صاحب نے نعتیہ ہائیکو کو ''کوثریہ'' کا نام دیا ہے۔

یہ جملہ معترضہ شاید ضروری تھا۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ رشیدہ عیاںؔ کی نعتیں شہر تمنا کے جلووں سے جگمگا رہی ہیں:

نبی کے روضے پہ جا کے اپنی نگاہ پر مجھ کو پیار آیا
کہ سبز گنبد پہ اک نظر سے میں سوا فلاک دیکھتی ہوں

میں جانتا ہوں کہ ''اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھے تھے ہم'' مگر رشیدہ عیاںؔ نے یہ راز عیاں تر کر دیا کہ فلک تو بلندی پر قائم حصار اور دائرے کا نام ہے۔ سات پر رفعت دائرے ''ہفت آسمان'' ہیں اور بنائے سماوات پر ہمارا ایمان ہے لیکن دیکھئے کہ محبت کے دائرے اور افلاک جداگانہ حقیقتیں ہیں۔

(فانوسِ ہفت رنگ/ رشیدہ عیاں، ۲۰۰۴ء، زین پبلی کیشنز، کراچی)

عقیدت کا سفر

جناب افتخار اجمل شاہیںؔ اس مختصر اور برگزیدہ گروہ کے ایک فرد ہیں جو ادب کی خاطر تخلیق کیا گیا ہے اور اس بات پر انہیں اپنے خالق کا احسان مند ہونا چاہئے۔

شاہیںؔ خود شناس و خودنگر آدمی ہیں اور ان کے جذبہ احسان مندی کا ثبوت ان کا زیرنظر مجموعہ ''عقیدت کا سفر'' ہے۔

میں عرصے سے شاہیںؔ صاحب کو جانتا ہوں، ہجرتوں کے سلسلے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان (آج کا پاکستان) نقل مکانی ایک بڑے شہر کے مسائل بے روزگاری اور نوکری کی الجھنیں۔ کوئی بات بھی ان پر غالب نہ آ سکی۔ معاشی جبر نے بھی انہیں کسی مرحلے پر خیر اور انسانیت کی قدروں اور ادب سے دور نہیں کیا۔ ان کی ذات کی توانائی کا بنیادی سبب دین سے ان کی ذہنی اور عملی وابستگی ہے۔

دین کا حقیقی مفہوم آشنا اندھیروں میں بھی امید اور یقین کی شمعوں کو روشن رکھتا ہے۔ انسانی قدروں پر اس کا یقین پختہ تر ہو جاتا ہے۔ ہمارے شعر و ادب کی بیشتر اقدار اخوت، مساوات، آزادی، خدمت خلق، محبت، ہمارے دین کا عطیہ ہیں اور ان اقدار کا سرچشمہ کتاب اللہ اور عملی نمونہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ افتخار شاہیںؔ انہیں اقدار سے وابستہ ہیں انہوں نے ایک استاد کی حیثیت سے علم کی روشنی کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا اور اس پیشے کو میراث نبویؐ سمجھ کر اس کے حق کو ادا کیا۔ افتخار شاہیںؔ کے لہجے میں متانت، آہستگی اور انکسار ہے۔ بزرگوں اور دوستوں کا احترام تو بہت

سے لوگ کرتے ہیں مگر وہ ہر انسان کی عزت کرتے ہیں اور اس حقیقت سے باخبر ہیں :

اصل مذہب احترامِ آدمیت

ایسے آدمی کی نعت میں محض رسمی عقیدت ہی نہ ہوگی بلکہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخلاقِ حمیدہ اور اسوۂ حسنہ کی حیات بخش اور نور افزا جھلک بھی ہوگی۔

''عقیدت کا سفر'' میں حمد، نعت اور منقبت سب ہی موجود ہیں اور یہ ایک ہی سلسلے کے دائرے ہیں۔ رب العزت جو انگنت جہانوں اور حدوشمار کے حصار میں نہ آسکنے والی بے شمار مخلوقات کا خالق ہے۔ اس کی مخلوقات میں روشن ترین اور افضل ترین اس کے رُسل وانبیاء ہیں۔ علیہ اسلام، ان کے سرخیل وسردار حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کا شاہکار ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور بالخصوص خلفائے راشدین شاہکار رسالت ہیں۔ ان سے بہتر انسانوں پر نہ سورج چمکا ہے اور نہ چمکے گا۔ ہدایت کے ستارے ہمیشہ انسانیت اور انسانوں کے راستوں کو منور کرتے رہیں گے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم احسانات میں پہلا احسان یہی ہے کہ انہوں نے معبود وعبد کو ہم رشتہ کردیا، ورنہ ان دیکھے خدا کو جاننے اور سمجھنے اور اس کو اپنی شہ رگ سے زیادہ نزدیک محسوس کرنے کے مرحلوں سے انسان کیسے گزر سکتا تھا۔ تصور الٰہ میں انسان کیسی گمراہیوں میں مبتلا ہوا ہے تاریخ مذاہب اس پر شاہد ہے۔ افتخار اجمل شاہینؔ کی حمد ومناجات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے رب کو اپنی ذات سے کس درجہ قریب محسوس کرتے ہیں۔ یہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسان ہے کہ تنہائی کا لمحہ اور عذاب مسلمان کی زندگی میں نہیں آتا۔ اللہ کی معیت کا احساس ہماری سب سے بڑی قوت ہے، وہ ہماری نبض کی تپش ہے، سانسوں کا آہنگ، قلب کی دھڑکن ہے۔ وہ ہمارے جیون کی نیا کا کھیون ہار ہے۔ وہ ہمارے خلوت کدہ دل کی آبادی ہے۔ اور ہمیں ہر برائی سے اس کا دھیان اور تعلق باز رکھتا ہے۔ یہی رب افتخار شاہینؔ کو ہر منظر کائنات میں نظر آتا ہے اور

ان ہزاروں آئینوں میں سب سے معتبر ان کے دل کا آئینہ ہے ان کی عبدیت اور بندگی میں کس درجہ یقین ہے:

آئینہ در آئینہ ہے جلوہ آرائی تری
اپنے دل میں دیکھتا ہوں شانِ یکتائی تری
میں جہاں بھی ہوں خدایا یاد تیری ساتھ ہے
میری محفل بھی ہے تیری میری تنہائی تری

اور اس ربِ عظیم کی آواز شاہین نے ایک اچھے مسلمان کی طرح اس کی کتاب مقدس کے الفاظ میں سنی ہے۔ اسی آواز نے انہیں اخلاقی عیوب سے بچنے کی قدرت دی ہے اور یہ تمنا پیدا کی ہے کہ اپنے دل کی وسعتوں میں اپنے مالک کو آباد کرنے کی کوشش کریں:

مجھے بخش دے وہ ساعت خدا
کہ غیبت کسی کی سنائی نہ دے
بسالوں میں دل میں تجھے اس طرح
کہ اس میں کوئی پھر سمائی نہ دے

اپنے رب اور ان کائناتوں اور ان حقیقتوں کا علم ہمیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کے وسیلے سے عطا ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ قرآن حکیم اللہ کی کتاب ہے اور ہم ایمان لے آئے۔ ہمارے رب کی ذات وصفات ہمیں آپ کے ذریعے معلوم ہوئیں۔

اس سے بڑھ کر کوئی شہادت اور شاہد کوئی نہیں۔ ان سارے حقائق کو افتخار اجمل شاہینؔ نے کس طرح ایک شعر میں سمیٹ لیا ہے:

ملی آگہی کی بصیرت انہیں سے
خبر بن کے آئے نظر بن کے آئے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کائنات میں تشریف آوری (ولادت باسعادت) کا مضمون شاہین کو بہت عزیز ہے۔ ان کی نعتوں میں میلادی اشعار جابجا ملتے ہیں۔ شاہیںؔ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری انسانی تاریخ کے ایک نئے عہد کا نقطہ آغاز ہے۔ ایک ایسا عہد جو قیام قیامت تک قائم اور باقی رہے گا۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

رسالت کا مہ کامل وہ خورشید زمن آیا
یہ دنیا سج گئی کیسی، جو جانِ انجمن آیا

آج دنیا میں جہاں صالح تمدن کے آثار ہیں جہاں کہیں انسانی اقدار کو فروغ حاصل ہے۔ جہاں کہیں انسانیت کی شمع روشن ہے وہ سب کچھ وہ سب محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ خواہ ایسے راستے پر چلنے والوں کو اس کا ادراک بھی نہ ہو۔

بقول اقبال جہاں کہیں تم کو جہانِ رنگ وبو نظر آئے اور جہاں کہیں آرزو کے غنچے کھل رہے ہوں۔ یہ سارا منظر نور مصطفیٰ کا عطیہ ہے، کیونکہ کائنات آج بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر تلاش مصطفیٰ میں مصروف ہے:

رونقِ محفل انہیں کی ذات ہے
ہیں محمدؐ شمع بزم کائنات

افتخار اجمل شاہیںؔ کی نعتیہ شاعری میں ان کا ذہن بھی شریک وشامل ہے۔ اور ان کا دل بھی۔ یہ پورے وجود کی شاعری ہے طیبہ ان کا خواب ہے اور ان کی نعتیہ شاعری طیبہ کے بلاوے کی طرح اس خواب کی تعبیر ہے۔

طیبہ سے آگیا ہے بلاوا زہے نصیب
تعبیر مل گئی ہے مجھے اپنے خواب کی

(عقیدت کا سفر/ افتخار اجمل شاہین، ۲۰۰۴، بزمِ شادانی، کراچی)

ثنائے خواجہ اور اقبالؔ عظیم

پروفیسر سید وقار عظیم کا سال پیدائش غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء ہے اور ان کے چھوٹے بھائی سید اقبال عظیم ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ والد سید مقبول عظیم پولیس میں ملازم تھے لیکن سرکار دو عالم ﷺ سے نسبی نسبت نے انہیں ان آلائشوں سے بچائے رکھا جنہیں پولیس کی ملازمت کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ میں نے انہیں تو نہیں دیکھا مگر وقار بھائی میری طالب علمی کے دور ہی میں زندگی کا حصہ بن گئے اور سید اقبال عظیم کو میں نے ۱۹۴۲ء میں پہلی بار سنا جب وہ حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں اپنا کلام سنانے پرنسپل عبدالشکور مرحوم کی دعوت پر آئے اور میں اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ پھر جب وہ مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے کراچی آگئے تو ان سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان دونوں بھائیوں کا کردار، لہجہ، انداز زندگی اس بات کی پختہ شہادتیں تھیں کہ صرف لقمۂ حلال میں ان کی پرورش ہوئی۔ یہ لقمۂ حلال بھی عجب چیز ہے کہ آدمی کو ہر دو جہاں سے غنی بنا کر اپنے رب کا شکر ادا کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

وقار بھائی اور اقبالؔ عظیم مرحوم نے بھی زندگی اپنے بچوں کے لیے لقمۂ حلال حاصل کرنے کی جدوجہد میں گزار دی۔ وقار بھائی دمے کے شدید حملوں میں بھی سرد راتوں کو درسی کتب مرتب کرنے، ریڈیو کے لئے تقریر لکھنے میں گزار دیتے تا کہ بچوں کی زندگی آسانی سے گزر سکے۔ اقبال راتوں کو صبح میں بدلتے دیکھتے تھے اور ان کی کاوشوں کا نتیجہ اطہر وقار عظیم، اختر وقار عظیم، نیر سلمہا، شاہین اقبال، تسکین اقبال اور فردوس عظیم کے کردار اور زندگیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اقبالؔ عظیم صاحب نے اسکول کے زمانے میں ہی شاعری شروع کردی تھی۔ ان کے کلام میں جیسے جیسے پختگی آتی گئی اسی قدر ان کی شاعری ان کی زندگی، ان کے افکار اور ان کے نظام شعور وفکر کی آئینہ دار بنتی گئی۔ ان کی غزل روایتی غزل ہرگز نہیں تھی انھوں نے غزل کے اسلوب اور اشاروں میں اپنے دور اور اپنی ذات دونوں کا حق ادا کیا۔ ان کی غزل میں دردِ ہجرت، خودداری کے ساتھ مل کر جدید غزل کا ایک نیا لہجہ بن گیا۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "مضراب" کے نام سے شائع ہوا اور اس کے دو سال کے بعد ہی ان کا نعتیہ مجموعہ اہل ذوق کے ہاتھوں میں تھا۔ "مضراب" اور "قاب قوسین" کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اپنی غزل میں سید اقبالؔ عظیم جن روایتوں، جن اقدار اور جن احساسات کو پیش کررہے تھے اس کا سرچشمہ بھی نبی مکرم ﷺ کی ذات عالیہ سے ان کی قربت تھی۔ غریبی کو احترام اور اعتماد عطا کرنا، اپنے سر کو مصائب میں بھی جھکنے نہ دینا، زندگی کے ہر لمحے کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور محمد مصطفےٰ ﷺ کی محبت سے آباد رکھنا سید اقبالؔ عظیم کی زندگی کا خاصہ ہے۔

سید اقبالؔ عظیم کی غزلیہ شاعری میں بھی ایسے شعر موجود ہیں جن کو نعتیہ اشعار کہا جاسکتا ہے لیکن مشرقی پاکستان سے ہجرت کرنے کے بعد نعت ان کی ذات اور شاعری کا مرکزی نقطہ بن گئی۔ اس امت کو اور اس کے افراد کو کسی افتاد اور بے کسی و بے بسی کے کسی دور میں دامن مصطفیٰؐ میں پناہ ملتی ہے۔

اقبالؔ عظیم نعت گوئی، نعت کے اطراف اور اس کے معنوی وفنی پہلوؤں سے خوب واقف تھے۔ نعت کے سوتے مومن کے قلب اور ذہن میں پھوٹتے ہیں۔ نعت دوسرے اصناف سخن کی طرح محاسن سخن کی نمائش، الفاظ کی آرائش، حسنِ بیان اور تخیل آفرینی سے علاقہ اور رشتہ نہیں رکھتی۔ نعت عشق رسول ﷺ بلکہ اس کے تقدس سے وجود میں آتی ہے جو خود بخود حسن بیان میں ڈھل جاتا ہے:

عشقِ آقاؐ کا تقدس دل میں جو محفوظ ہے
نعت میں ڈھل کر مرے حسنِ بیاں تک آ گیا

نعت صنفِ سخن تو ہے ہی مگر اس کے ماسوا اور اس کے ماورا بھی ایک چیز ہے۔ یہ درِ مصطفیٰ ﷺ کے گداؤں کا انداز زیست ہے جن کی گدائی سے اہل زر کے سر جھک جاتے ہیں:

ہم ماتھے پہ بل ڈال کے بازار سے گزرے
ہم جیسے فقیروں کو کوئی دے بھی تو کیا دے

اور کردار کو یہ رفعت تعلیم، اسوۂ حسنہ نبی ﷺ کو معیار بنا کر حاصل ہوتی ہے:

حب سرتاج رسل دل میں بسا کر دیکھو
اُن کی تعلیم کو معیار بنا کر دیکھو

گلدستہ نعت لفظوں کے پھول جمع کرنے سے نہیں بنتا بلکہ یہ باغ حرم کے پھولوں سے وجود میں آتا ہے۔ باغ حرم کے یہ پھول حیات و اسوۂ رسالت مآب ﷺ میں روشن اور معطر ہیں:

گلدستہ اک سجانا ہے نعتِ رسولؐ کا
کچھ پھول چُن کے لائے ہیں باغ حرم سے ہم

حقیقی نعت گو شاعر اسوۂ حسنہ نبویؐ پر نظر رکھتا ہے اور یہی اس کا حقیقی موضوع سخن ہے اس اسوۂ حسنہ کی تقلید میں رسول کریم ﷺ کے برگزیدہ امتی جس طرح زیست کرتے ہیں اس کی ایک بہت خوبصورت جھلک جناب اقبال عظیم کی ایک نعت کے ان اشعار میں یوں نظر آتی ہے کہ ہم جیسے امتیوں کا قد بھی بلند ہوجاتا ہے:

نبیؐ کے چاہنے والے غمِ دنیا نہیں کرتے
کوئی دکھ ہو، کوئی مشکل ہو، وہ پروا نہیں کرتے

عطا کرتا ہے صبر و شکر کی نعمت خدا اُن کو
پریشانی کے عالم میں بھی وہ شکوہ نہیں کرتے
گزر اوقات ہوجاتی ہے ان کی فقر و فاقہ میں
مگر وہ اپنی غیرت کا کبھی سودا نہیں کرتے

نبی مکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ ہی سے ہم پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے اور ہر دکھ ہر مشکل کا علاج اللہ کا ذکر ہے۔ مسلمان کی دو ہی شانیں ہیں۔ وہ کبھی شکر میں زندگی کے لئے لمحے گزارتا ہے اور کبھی صبر میں غم حیات کو سہل بناتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ اور ان کے امتیوں کا باہمی رشتہ ایک مسلسل اور مستقل موضوع کی طرح اقبال عظیم کی نعت سے ابھرتا ہے۔ حضور ﷺ کا اسم گرامی ہماری پہچان اور شناخت ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:

آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

مغرب والے اس رشتے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بار بار توہین رسالت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیات اس رشتے کو اور اس کی گہرائیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتی کہ آج پندرہ سو سال کی مسافت پر مسلمان کس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طرز حیات کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اٹھنے، بیٹھنے میں جاگنے میں، سونے میں، انداز گفتگو میں اور اپنی صورت شکل کو اسی سانچے میں ڈھالنے میں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ جہالت اور کم علمی سے ہم میں سے کچھ لوگ اسلام کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ سچ ہے کہ اسلام اور جہل ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ آج مسلمانوں کے بیشتر مسائل کا سبب اپنے ہادی و رہنما ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور طرز حیات سے دوری ہے۔ اس پر اضافہ کیجئے مسلمانوں کے ساتھ اسلام دشمنوں کے طرز عمل کا لیکن پھر بھی مسلمان حضور ﷺ کے

اتباع کے ذریعہ اپنی باز آفرینی اور اپنے آپ کو پالینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اقبالؔ عظیم نے اس صورت حال کو ایک بہت خوبصورت شعر میں ایک پرقوت استعارے کے ذریعے پیش کیا ہے:

زخم خوردہ اک پرندہ پنجۂ صیاد کا
توڑ کر زنداں کو اپنے آشیاں تک آگیا

آج مسلمان فقرِ نبوی کی تلاش میں آپ کے اسوۂ حسنہ سے استفادہ کر رہا ہے اور فقرِ نبیؐ کے آستاں تک پہنچنے کی کوشش کے سوا کچھ اور نہیں ہے:

شوکتِ شاہانِ عالم اُس فقیری پر نثار
جس فقیری کو نبیؐ کا آستاں بخشا گیا

چند شعر نبیؐ کریم اور ان کے امتیوں کے باہمی رشتے کے بارے میں پیش کئے جاتے ہیں اس رشتے کی بازیافت روشن مستقبل کی طرف مسلمان کے سفر کا نقطۂ آغاز بنے گی۔ اس رشتے میں ناموس رسالت کی حفاظت اساس کا درجہ رکھتی ہے:

ورثہ میں ملا ہے ہمیں پندارِ شجاعت
ناموس پہ مرمٹتے ہیں جو لوگ وہ ہم ہیں
وہ جانتا ہے کہ تقلیدِ مصطفیؐ کیا ہے
جو دوستوں کی طرح اجنبی سے ملتا ہے
اُن کو کیوں رحمتِ کونین کہا جاتا ہے
طائف و مکہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
سیرتِ پاک نبیؐ کیا ہے نبیؐ خود کیا ہیں
پوچھتے کس سے ہو قرآن اٹھا کر دیکھو

اپنے عہد نعت گوئی میں اقبالؔ عظیم صاحب اپنی بصارت سے محروم ہو چکے تھے

لیکن حب نبیؐ نے انہیں وہ بصیرت عطا کی جو دونوں جہانوں کا سرمایہ ہے۔ یہ آنکھیں جو نور کھو چکی تھیں ان سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والے آنسو ایک اندازِ گفتگو بن گئے تھے وہ انداز گفتگو جس میں شاعر نے اپنی اور امت مسلمہ کی روداد نبیؐ کے حضور پیش کردی:

یہ صرف آنسو نہیں ہیں میرے جو قطرہ قطرہ چھلک رہے ہیں
یہ ایک انداز گفتگو ہے، کلام کرتی ہیں میری آنکھیں

اقبالؔ عظیم صاحب کے ایسے اشعار پڑھ کر مجھے ایک بزرگ یاد آتے ہیں جنہیں میں نے ۱۹۶۸ء میں مسجد نبویؐ کے صحن میں بیٹھے دیکھا تھا۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی اور وہ بزرگ مسلسل گنبد خضریٰ کی طرف نگراں تھے۔ میں قریب گیا تو دیکھا کہ وہ بصارت سے محروم ہیں لیکن ان کی بصارت سے محروم آنکھیں گنبد حضریٰ سے کسب نور کر رہی تھیں جیسے گنبد خضریٰ ایک استعارہ ہو اور کسب نور آقا ﷺ سے کیا جارہا ہو۔ اس روشنی کی حقیقت کو اقبالؔ عظیم نے کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے:

دیکھا ہے میں نے ان کو تصور میں بارہا
پہچانتا ہوں میں رخِ زیبا کی روشنی
روشن ہو جس سے قبر وہ تنویر چاہیے
میں کیا کروں گا لے کے یہ دنیا کی روشنی

خدا کرے ان کی یہ تمنا پوری ہوئی ہو اور جمال مصطفیٰ کی روشنی میں ان کی قبر میں جنت کا دریچہ وا ہوگیا ہو۔ یہ ہی مدحتِ مصطفےٰ ﷺ کا اجر ہوسکتا ہے۔

(سہ ماہی "روشنائی" کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء نیز "زبورِ حرم"
(کلیات نعت/ اقبال عظیم کی اشاعت دوم ۲۰۱۰ء میں بھی شامل ہے۔)

کرم ونجات کا سلسلہ

(عزیز احسن کے شعرِ عقیدت پر ایک نظر)

اسلام کرم ونجات کا ایک مسلسل سلسلہ ہے، جو ہماری آخرت اور دنیا دونوں کا احاطہ کرلیتا ہے۔ اسلام کی ایک جامع تعریف یہ ہے کہ اپنے نفس کو ان تمام باتوں پر راضی کرلینا جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے۔ اس میں معتقدات بھی شامل ہیں، مسائل و معاملات بھی شامل ہیں۔ معاشرت بھی شامل ہے اور ان تمام باتوں کے ساتھ وہ روحانی و قلبی کیفیات بھی جو نبی اکرم ﷺ سے متعلق ہماری ذات میں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام محض عقائد کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ وہ ان ذہنی، نفسیاتی اور ہمہ گیر کیفیات کا نام ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پیغام سے وابستگی ہمارے قلب ونظر میں پیدا کرتی ہے۔ اس گہرے اندرونی ربط کے بغیر اسلام محض ایک اوپری چیز بن کر رہ جائے گا۔ بقول اقبالؔ، مصطفیٰ ﷺ ہمہ دین ہیں اور اگر آدمی ان کی ذات عالیہ تک نہ پہنچے تو پھر بولہبی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ان گزارشات سے نعت کی اہمیت اور نعت کی حدود کا اندازہ ہوسکتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ نعت گو کے فرائض اور ذمہ داریوں کا بھی۔ ہمارے ہاں عام نعتیہ شاعری چند رسمی مضامین کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی لیکن حالات کے جبر نے ہمیں اسلام اور محمد ﷺ شناسی پر مجبور کردیا۔ اردو شاعری کے دامن میں حقیقی نعت کے جوہر ریزے موجود تھے۔ محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خان، اقبال اور ظفر علی خان کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان کے اثرات نے حقیقی نعت گوئی کا شعور بعد کے شعرا میں پیدا کیا۔ ان شعرا کے نام میں مثالاً بھی پیش نہیں کروں گا کہ کہیں کسی اہم مداحِ مصطفیٰ ﷺ کا نام حافظے سے محو نہ ہوجائے۔

پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کی تمنا نے ہمیں پھر سرورِ کائنات ﷺ کی بارگاہ عالیہ میں پہنچا دیا اور یوں کہ ہم اردو شاعری کے عصر رواں کو بجا طور پر نعت گوئی کا دور کہہ سکتے ہیں اب تک نعت ادبی تنقید سے بالاتر سمجھی جاتی تھی کہ حضور ﷺ کے کسی ثنا خواں کے فن پر تبصرہ اور خاص طور پر تنقید، بے ادبی سمجھی جاتی تھی، لیکن سرکار ختمی مرتبت ﷺ کے رتبۂ بلند کا تقاضا تھا کہ ان کی مدح کو محض " روایت"اور سنی سنائی بات بنانے والوں کی گرفت کی جائے۔ اردو نعت گوئی بعض تذکرے موجود تھے لیکن ان میں تنقید سرے سے غائب تھی۔ الحمد للہ نعت پر متوازن تنقید کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی ابتدا ایک مسلسل روایت کے طور پر جریدہ " نعت رنگ" کراچی کے صفحات پر ہوئی اور جو نقاد سامنے آئے ان میں جناب عزیز احسن کا نام بہت معتبر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذات میں اسلام کی چنگاری موجود تھی جو نسبت مصطفیٰ ﷺ سے بلند اور روشن ہو کر شعلۂ تابندہ بن گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ حقیقی تصوف نے انہیں سطح کے نیچے دیکھنے کی صلاحیت عطا کی۔ تصوف، احسان اور تزکیہ کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں۔ پھر عزیز احسن کا جدید اور قدیم ادب کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ مشرقی اصول تنقید سے بھی باخبر ہیں اور مغربی تنقید کے بھی رمز آشنا ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کی عام شاعری بالخصوص نعتیہ شاعری کا مطالعہ کیا ہے اور مختلف رجحانات اور دھاروں کو جانتے ہیں۔ ان کی علمی آگہی کی حقیقی بنیاد قرآن و حدیث سے ان کی وابستگی ہے، کیوں کہ ان دونوں سرچشموں سے دور رہ کر آدمی روح اسلام سے آشنا نہیں ہوسکتا اور رسول اللہ ﷺ کے مقام کو نہیں جان سکتا۔

الحمد للہ اس علمی پس منظر کے ساتھ عزیز احسن صاحب ایک دل زندہ کے مالک بھی ہیں، اس دل زندہ کی دھڑکن اسم محمد ﷺ ہے اور یہی دھڑکن ان کی نعت گوئی بن گئی۔ اسلام کے حقیقی مفہوم سے شناسائی کی وجہ سے وہ نعت گوئی کو اسلام کے تمام پہلوؤں کی جذباتی اور تخلیقی پیش کش کے مترادف سمجھتے ہیں۔ان کے شعر عقیدت کا مجموعہ " کرم ونجات کا سلسلہ "نعت گوئی اور شعر گوئی کا اچھا معیار پیش کرتا ہے۔

عجب بات ہے کہ نعت گوئی کے اس دور میں اچھی حمدیہ شاعری خال خال نظر آتی ہے۔ الحمدللہ کہ بعض حمدیہ مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس وقت مجھے اس سلسلے میں جمیل عظیم آبادی کے حمدیہ مجموعے کا خیال آرہا ہے۔نعتیہ شعری کی اس صورت حال کا سبب کیا ہے، اس پر میں نے اکثر غور کیا۔ وہ ذات جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس سے اتنی دوری کیوں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم اپنے آپ سے دور ہیں۔ لیجیے میر صاحب یاد آگئے:

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
کہ معلوم اب ہوا بہت میں بھی دور تھا

اللہ تعالیٰ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اور کتاب کائنات کے ہر ورق پر موجود ہے۔ اس کا جلوہ کہاں کہاں نہیں۔ عزیز احسن کے اس مجموعے میں کئی حمدیں موجود ہیں۔ کبھی تخاطب کے ساتھ، کبھی اپنی ذات کی گہرائیوں کی غوطہ زنی کی صورت میں اور کبھی مناجات کی شکل میں۔ مناجات، اس حرف بے اختیار کا نام ہے جو حالات کے جبر میں انسان کے لبوں تک آجاتا ہے۔ عزیز احسن صاحب کے چند حمدیہ شعر پیش کرتا ہوں جو آپ کو یہ احساس دلاسکیں گے کہ ہر مرحلہ حیات میں عزیز احسن کی چشم حقیقت نگر نے اللہ کو دیکھا ہے اور اس کا پکارا ہے۔ وہ اللہ جس کی کوئی صورت نہیں، جو جسم کی حد بندیوں سے بالاتر ہے، جس کی تصویر کثرت جلوہ سے معدوم ہو کر دل وحدت آشنا کے آئینے میں جلوہ گر ہوتی ہے:

دل پر مرے احساس نے جو حرف لکھا ہے
ہے تیرے سوا کون کہ جس نے وہ پڑھا ہے

تو نے ہی تو ہر مرحلۂ شوق پہ یارب!
اس چشم تماشا کو نیا عزم دیا ہے

دشت تحیر آج بھی پھیلا ہوا ہے ہر طرف
اے مرے رب تری طرف ہو بھی تو کس طرح سفر؟

اللہ ہی ابتدا ہے، وہی انتہا ہے۔ " سر توحید" کا آغاز ان مصرعوں سے ہوتا ہے:

میں وادئ کوہ میں کھڑا تھا
جہاں عروس سحر نے آکر
نقاب رُخ سے اُلٹ دیا تھا
وہ سرمدی راز کھولنے پر تلی ہوئی تھی!

اور پھر ساری کائنات نغمۂ توحید اور نظارۂ توحید میں بدل جاتی ہے، کیوں کہ ہر ذرۂ کائنات اس کی آیت ہے۔ زمین کی وسعت اور آسمان کی بلندی میں اس کا چہرہ دمک رہا ہے اور پھر اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے انسانوں کی بصیرت پر نئی آگہی کے دروازے کھول دیے۔ عزیز احسن اس گم راہی میں مبتلا نہیں:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اللہ، عزیز احسن کے لئے زندہ وجود ہے۔ ایسا زندہ وجود جو حی قیوم ہے۔ زندگی کی ہر صورت جس سے عبارت ہے جہاں عزیز احسن جبر دیکھتے ہیں۔ ظلم دیکھتے ہیں، اہل ایمان کی آزمائش دیکھتے ہیں تو چلا اٹھتے ہیں:

ظلم کا راج ہوا تیری زمیں پر یارب!
ساری دنیا میں نہتے ہوئے بے گھر یارب!
اہل دل درد کی سوغات لیے پھرتے ہیں
دیکھتے رہتے ہیں خاموش یہ منظر یارب!
تیرے محبوب کی اُمت ہے بہت خوار وزبوں
دین اسلام کے معیار کو کھو کر یارب!
بخش دے اب تو گنہ گار مسلمانوں کو
تیری رحمت ترے غصے سے ہے بڑھ کر یارب!

اس مجموعے کے حمدیہ حصے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مناجات پر تضمین ایک بہت خوب صورت شعری پیش کش ہے۔ کسی مسلمان کے لئے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آواز سے اپنی آواز ملانے کی کوشش کر سکے۔ نعتیہ حصے میں بیشتر نعتیں غزل طور ہیں میں اس مسئلے پر اپنے مضامین میں کافی لکھ چکا ہوں کہ غزل کا پیرایہ، اپنی نفاست، ایمائیت، ہمہ گیریت کی بنا پر نعت کے بہت مناسب ہے غزل کا لہجہ حدیث دل کا لہجہ ہے۔ اچھی نعت میں فکر پہلو یقیناً ہوتا ہے مگر اس کا شعر کے آہنگ میں ڈھل جانا، شاعری کو آبرو عطا کرتا ہے۔ اس مجموعے کا نام جس نعت سے اخذ کیا گیا ہے اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

نہ تو لوح کا تھا گماں کوئی نہ قلم دوات کا سلسلہ
تری نور کا یہ طفیل ہے کہ چلا حیات کا سلسلہ
میں عزیزؔ نعت نبیؐ لکھوں تو امید ہے کہ پہنچ سکے
مری ذات تک بھی جزا کے دن کرم ونجات کا سلسلہ!

اس مطلع میں عزیز احسن نے اس کائنات کی زندگی کو نور محمدیﷺ کا عکس قرار دیا۔ یہ خیال اوروں کے ہاں بھی ملتا ہے کیوں کہ یہ مضمون حدیث سے اخذ ہے، لیکن عزیز احسن نے اس نعت میں انسانی سطح پر زندگی کے تسلسل کو نور محمدیﷺ کی جلوہ گری سے تعبیر کیا ہے اور اُس ذات کے کرم ونجات کا سلسلہ دامن قیامت سے جڑا ہوا ہے۔ ان غزلیہ نعتوں میں اسلوب کی رنگارنگی نعت ہے کہیں گو طول ردیفیں، کہیں " فعل مجہول" کو کرم خداوندی کا اشاریہ بنانا:

ہم کو دامن اُنؐ کو گنج شائگاں بخشا گیا
یوں فقیروں کو وہ دست مہرباں بخشا گیا

اور کہیں غیر مردف نعتوں میں صوت ومعنی کی ہم آہنگی کی دنیا تعمیر کرنا:

جن کے اوصاف حمیدہ کا خزانہ ہے قیاس
اُنؐ کی خدمت میں کروں کیا پیش میں حرف سپاس؟

علم، شعور، آگہی، تفہیم کائنات، رنگ، خوش بو، منزل یہ سب ذات رسولﷺ کے استعارے ہیں۔ ان استعاروں میں عزیز احسن کو سرکارﷺ کی نسبت سے روشنی کا استعارہ بے حد پسند ہے۔ روشنی، علم بھی ہے، عرفان بھی اور آگہی بھی۔ روشنی سے اپنی ذات کے پردے بھی اُٹھتے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے بعد جو فجر طلوع ہوئی ہے۔ اس کی روشنی ابدالآباد تک ذہنوں اور کائنات کو روشن رکھے گی:

اے نورِ ازل چراغ آخر
مجھ کو بھی تو روشنی عطا کر
ذرہ ذرہ مصطفیٰ سے چاہتا ہے روشنی
سب سمجھتے ہیں کہ بس ان کی عطا ہے روشنی
ان کی تنویر رسالت نے بتایا خلق کو
دین حق کے ساتھ پیمان وفا ہے روشنی
مہر و ماہ و انجم و برق و شرار و کہکشاں
ہیں تو سب روشن، مگر دل کی جلا ہے روشنی
ذکر رسول پاک سے پہنچی ہے قلب تک
وہ سلسبیلِ نور وہ جنت کی روشنی
صدقے میں ان کی مدح نگاری کے پاسکوں
اے کاش! روز حشر شفاعت کی روشنی!

عزیز احسن نے عشق محمد ﷺ کی روشنی میں نعت گوئی کا سفر طے کیا ہے۔

شاعری لفظوں کی زبان سے بولتی ہے۔عزیز احسن نے نئی تراکیب وضع کی ہیں۔ وہ زبان کے مزاج شناس ہیں اسی لئے ان کی تراکیب اجنبی نہیں لگتیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے یہ ترکیبیں ہماری زبان میں ہمیشہ سے موجود رہی ہیں۔ تراکیب سازی میں شاعر دو یا زیادہ لفظوں کے ملانے سے ایک نیا تلازمہ اور استعارہ تراشتا ہے۔ ابھی ہماری تنقید نے تراکیب لفظی اور استعارے کی معنویت کے باہمی رشتے کو نہیں سمجھا ہے۔ بحث عبدالرحمٰن بجنوری نے " محاسن کلامِ غالب"میں چھیڑی تھی، لیکن بعد کے لوگوں نے اسے آگے نہیں بڑھایا۔عزیز احسن کی نعت کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں جن میں نئی تراکیب سے معنی کے نئے دریچے کھل رہے ہیں:

دل کے صحرا میں کھلے لالۂ طاعت آقاؐ
مجھ کو حاصل ہو کبھی یہ بھی سعادت آقاؐ
کاش وہ دن بھی کبھی آئے کہ میں دیکھ سکوں
شہر کردار پہ بس تیری حکومت آقاؐ

دعا ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا یہ چمن جسے عزیز احسن کے ذہن اور دل نے سجایا ہے سدا شاداب رہے، مہکتا رہے اور روشن رہے۔

(نعت رنگ ،شمارہ ۲۰، اگست ۲۰۰۸ء)